جنوری تا مارچ 2023ء

جلد اول/شمارہ سوم

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مدیر منتظم: ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

مدیر: کومل شہزادی

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا
غالب

مجلس ادارت

- ڈاکٹر نصیر احمد اسد
- ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ
- کومل شہزادی
- ڈاکٹر انصر جاوید گھمن

ناشر

پنجاب لٹریری فورم سیالکوٹ

سرورق پر قلی قطب شاہ کی تصویر ہے۔

ASIAN RESEARCH INDEX

کلاسیکی اور جدید ادب کا ترجمان

نقش فریادی

جنوری تا مارچ 2023ء

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر نصیر احمد اسد

مدیر منتظم: ڈاکٹر عبد المنان چیمہ

مدیر: کومل شہزادی

نائب مدیر: فرید الدین مسعود برہانی

معاون مدیران:

ڈاکٹر انصر جاوید گھمن

ڈاکٹر طالب علی اعوان

ڈاکٹر محمد اکرم

پروفیسر محمد انوار الٰہی چودھری

قانونی مشیر: ڈاکٹر شکیل اختر ٹھاکر ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

جلد: اول شمارہ: 3 ـــــــ جنوری تا مارچ 2023

برقی پتہ: Naqshfaryadi99@gmail.com

فون نمبر: 03316729376

پتا: فرسٹ فلور بزنس اینڈ کامرس سینٹر پیرس روڈ سیالکوٹ (پاکستان)

ARI ID: 1695781782714

OPEN ACCESS

CC BY

ECO FRIENDLY

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

مجلس مشاورت

ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ(ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان)
ڈاکٹر محمد یوسف خشک (چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان)
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی(ماہر اقبالیات)
پروفیسر ڈاکٹر غلام عباس گوندل (ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز یونیورسٹی آف سرگودھا)
پروفیسر ڈاکٹر شفیق آصف(ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز یونیورسٹی آف میانوالی)
پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال بٹ(ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیومینیٹیز گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ)
پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل(صدر شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)
پرفیسر ڈاکٹر فرحت نسیم علوی(صدر شعبہ علوم اسلامیہ،یونیورسٹی آف سرگودھا)
پروفیسر ڈاکٹر آصف اقبال یونیورسٹی آف ایجوکیشن فیصل آباد
پروفیسر ڈاکٹر عامر اقبال (یونیورسٹی آف سیالکوٹ)
پروفیسر ڈاکٹر طارق کلیم صدر پیپلا (ایم اے او کالج)
میاں محمد آصف اقبال(آئی جی ریٹائرڈ)
پروفیسر ڈاکٹر احمد عبداللہ قمر (گورنمنٹ گریجویٹ کالج کروڑ لیہ)
ڈاکٹر جاوید اقبال جاوید(اسسٹنٹ پروفیسر لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور)
پروفیسر ڈاکٹر عدنان احمد یونیورسٹی آف نارووال
پروفیسر ڈاکٹر محمد یار گوندل یونیورسٹی آف سرگودھا
پروفیسر ڈاکٹر علی قزلباش کمیلی(مدیر "پیغام آشنا" ایرانی قونصلیٹ اسلام آباد)
پروفیسر ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، مصر
پروفیسر ڈاکٹر احمد محفوظ، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، بھارت
پروفیسر ڈاکٹر ڈرمس بلگر، شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی

ترتیب

اداریہ		**7**
نعت: تجمل حسین تجمل قادری		8
مضامین:		
۱۔ محمد الدین فوق کی ادبی خدمات	ڈاکٹر نصیر احمد اسد	9
۲۔ حبیب تنویر کا ڈرامہ "آگرہ کا بازار	احمد سہیل	19
۳۔ عساکر میں نعت کا ابتدائیہ اور افواجِ پاکستان کے نعت گو	شاکر کنڈان	29
۴۔ ناول رقص نامہ میں سندھی عناصر اور سندھی سماج	کومل شہزادی	42
5۔ اردو شاعری میں قدرتی مظاہر کی تصویر کشی	ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ	48
6۔ مرزا محمد. رفیع سودا کے اشعار میں سائنسی شعور	سجاد نقوی	53
7۔ منٹو کے افسانوں میں خاندان کی مذہبی اور ثقافتی حیثیت	وجیہہ ضمیر	62
8۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ___ ایک جائزہ	عبداللہ نعیم رسول	67
تبصرے		
"تاریخِ ادبیاتِ سیالکوٹ" ایک مطالعہ	شاکر کنڈان	74
افسانچہ:		
۱۔ اجازت	شاہد اشرف	82
افسانہ:		
۱۔ بندھن کا بوجھ	ثمینہ سید	83
۲۔ کرونا کا رن	شاکر انور	88
۳۔ مقناطیس	ڈاکٹر جمیل حیات	92

غزل:

ا۔ فرحت شکور 102

2۔ڈاکٹر شفیق آصف 103

3۔ڈاکٹر انوار علی انوار 104

4۔رحمان امجد مراد 105

5۔نوید ملک 105

6۔ مبشر سعید 106

7۔طاہر وحید 107

8۔سید عدید 108

نظم:

ا۔ڈاکٹر شفیق آصف 109

۲۔ازہر ندیم 110

۳۔طاہر وحید 111

کچھ نقش فریادی کے بارے میں

نقش فریادی ایک تعارف۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ ضمیر

اداریہ

سیالکوٹ کی تہذیب قدامت کے لحاظ سے پانچ ہزار سال سے بھی پہلے کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ راجہ شل نے اس تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس شہر کی تہذیبی روایات اور علمی آثار "مہابھارت" میں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ سیالکوٹ کی مٹی بڑی زرخیز اور مردم خیز ہے۔ سرزمین سیالکوٹ نے علم وادب وفنون لطیفہ کے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ سیالکوٹ کی علمی وادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ ہر دور میں خواہ وہ ہندو راج ہو، مغلیہ راج ہو یا انگریز راج سیالکوٹ نے ہر دور میں علمی وادبی مرکز کے حوالے سے اپنی شناخت قائم رکھی ہے۔ یہاں سے بہت سی نامور روحانی اور علمی وادبی شخصیات نے جنم لیا ہے اور بعض نے یہاں کی روحانی اور علمی وادبی شخصیات سے فیض حاصل کیا ہے۔ ۷۰۰ قبل مسیح سے ۶۰۰ قبل مسیح تک یہ اتنا عظیم تعلیمی مرکز تھا۔ کہ بنارس کے شہزادے حصول علم کے لیے یہاں آتے تھے۔

اکیسویں صدی عیسویں میں بھی شہر اقبال اپنی تہذیبی و ادبی روایات کی بازیافت کے لیے خاصا سرگرم عمل ہے۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا فیروزالدین، اقبال، فیض، مولانا ظفر علی خاں، ہاشم شاہ، حضرت رائج سیالکوٹی، دلشاد، منشی میراں بخش جلوہ، محمد الدین فوق، اثر صہبائی، سلیم واحد سلیم، بدری ناتھ سدرشن، جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، رجندر سنگھ بیدی، عبدالحمید عرفانی، سرمد صہبائی، خالد نظیر صوفی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ساغر جعفری، مولوی ابراہیم میر، آسی ضیائی رامپوری، طفیل ہوشیارپوری، اے ڈی اظہر، حفیظ صدیقی، صابر ظفر، اصغر سودائی اور جابر علی سید دنیائے شعروادب کے اہم ستارے ہیں۔ جن کا تعلق سیالکوٹ کی دھرتی کے ساتھ تادم حیات رہا۔ موجودہ دور میں بھی خطہ سیالکوٹ علمی وادبی میدان میں مضافاتی دائرے سے نکل کر قومی وبین الاقوامی ادبی دھارے میں شامل ہونے کے لیے پرتول رہا ہے۔ پنجاب لٹریری فورم سیالکوٹ اسی سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس ادبی تحریک کا ثمر اس خطے کی ادبی سرگرمیوں کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ سہ ماہی "نقش فریادی" اسی نشاۃ ثانیہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رسائل وجرائد، علمی وادبی روایات کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دانش وفنون کی ترویج کا بھی موثر ذریعہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ قارئین کے لیے یہ بات خوش آئند ہے کہ ملک کے نامور محققین وناقدین اور قومی وادبی اداروں کے سربراہان "نقش فریادی" کی مجلس مشاورت میں شامل کئے گئے ہیں۔ سہ ماہی "نقش فریادی" کا تیسرا شمارہ قارئین ادب کے ذوق مطالعہ کی نظر اس اُمید کے ساتھ کہ یہ ادبی اقدار کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

مدیر اعلیٰ ڈاکٹر نصیر احمد اسد

ازل تھے ہے مجے خوباں سوں اخلاص
ابد لگ مج ہے محبوباں سوں اخلاص
اگر توں عاشق صادق ہے طالب
نہ کر توں باج مطلوباں سوں اخلاص
سکی کا حسن کیتا جذب مولود
اسی تے مج ہے محبذوباں سوں اخلاص
پیاری کے چھنداں ہے سب کوں مرغوب
مجے لازم ہے مرغوباں سوں اخلاص
جو ہے مکتوب مانند حال وخط سوں
دھروں میں اس تھے مکتوباں سوں اخلاص
نین ناری کے قلابے ہیں مشہور
دھروں میں اس تھے مقلوباں سوں اخلاص
نبی صدقے قطب شہ کم جہت
سدا دھرتا ہے توخوباں سوں اخلاص

قلی قطب شاہ

نعت

تجمل حسین تجمل قادری

وادیءِ سرورِ ﷺ لولاک میں گُم ہو جاؤں
مَیں مدینے کی حسیں خاک میں گُم ہو جاؤں

کاش سرکار ﷺ کے نعلَین کا ذرّہ ہوکر
مُسکراتے ہوئے اَفلاک میں گُم ہو جاؤں

اے خدا اِتنا بڑھا دے تُو مِرا رزقِ سُخَن
راحتِ قلب کی خوراک میں گُم ہو جاؤں

حرف مِدحَت کے اُترتے ہیں مِرے سینے میں
جب کبھی دیدہءِ نَمناک میں گُم ہو جاؤں

آج ہوجائے عطا مقطعِ انوار کوئی
آج پھر مطلعِ اِدراک میں گُم ہو جاؤں

اِس قدر تُونے تراشے ہیں خدوخالِ حیات
دِل یہ کرتا ہے ترے چاک میں گُم ہو جاؤں

جب تلک وَصل کی راحت نہ میسّر آئے
کیوں نہ پھر ہجر کی پوشاک میں گُم ہو جاؤں

اَب تو بَس ایک ہی خواہش ہے تجمّل میری
مدحتِ پنجتنِ پاک میں گُم ہو جاؤں

مضامین

محمد الدین فوق کی ادبی خدمات

ڈاکٹر نصیر احمد اسد

محمد الدین فوق (۱۸۷۷ء) کوٹلی ہرنرائن سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ فوقؔ تخلص کرتے تھے۔ فوق بڑے ذہین تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہور نظم "کیا خوب سودا نقد ہے' اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کا فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ فوق فطری شاعر تھے اور بچپن سے ہی موزوں طبع تھے۔ فوق نے ۱۸۹۲ء میں شعر کہنے شروع کئے۔ ان کا ایک ایک شعر وطن (کشمیر) کی محبت اور اسلام کے درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ فوق پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مستقل طور پر مسلمانِ کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے دنیا کو ان کی مظلومیت سے آگاہ کیا۔

آپ کی شاعری کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح بھی تھا۔ اقبال نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" نظمیں لکھی ہیں۔ فوق نے بھی اسی طرح "بڈشاہ کی روح سے خطاب" نظم میں کشمیریوں کی زبوں حالی کا اسی لہجہ میں رونا رویا ہے۔ فوق غزل میں داغ دہلوی اور قومی نظموں میں علامہ اقبال سے متاثر تھے۔ فوق کا شعری کلام ہندوستان کے معروف رسائل میں چھپتا رہا۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ "کلامِ فوق" کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۱ء تک کا کلام ہے اس حصے میں غزلیں زیادہ ہیں۔ دوسرا حصہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کے کلام پر محیط ہے۔ اس حصے میں نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ کلامِ فوق کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا اس کی ضخامت ۱۴۰ صفحات سے بڑھ کر ۲۴۰ صفحات تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں پروفیسر علم الدین کا مفصل دیباچہ بھی شامل ہے۔ فوق کا دوسرا شعری مجموعہ "نغمہ و گلزار" کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس کی ضخامت ۱۸۴ صفحات ہے اس کا دیباچہ مولانا عبداللہ قریشی نے لکھا ہے۔

اگر فوق کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو راکھ کے ڈھیروں میں جذبات و تخیلات کی چنگاریاں دبی نظر آتی ہیں۔ فوق کی شاعری دھوم دھڑکے کی شاعری نہیں۔ آتشِ چنار کی دھیمی آنچ والی شاعری ہے جس میں قومی دردمندی اور اخلاقی آرزومندی کی تاثیر گھلی ہوئی ہے۔ فوق سیاسی معاملات کو سماجی اور تاریخیپس منظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ فوری طور پر کسی واقعہ یا منظر سے متاثر ہو کر بھی شعر کہتے تھے مگر اس کے سیاق و سباق پر ان کی پوری نظر ہوتی تھی۔ موضوعات کی براہِ راست پیش کش کا اسلوب ان کے ادبی اور شعری مزاج کا حصہ تھا۔ وہ جس موضوع پر چاہتے تھے لکھ لیتے تھے لیکن ان کے ہاں موضوعات کا تنوع نہیں کیونکہ انہوں نے خود کو کشمیر کیلئے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں شاعری کی ہے۔ بحیثیت شاعر وہ اپنے آبائی وطن سے جس والہانہ پن

کا مظاہرہ کرتے ہیں اس پر انہیں شاعرِ کشمیر کا خطاب دیا گیا۔ عبد اللہ قریشی نے "شاعرِ کشمیر" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے "شاعرِ کشمیر" کے نام سے ایک نظم لکھی جو فوق کے شعری مجموعے "نغمہ و گلزار" کے صفحہ ۳۰ پر موجود ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

فوق صاحب ہیں جو میرے خواجہ تاش
خوش خیال و خوش مزاج و خوش معاش
پیرو شاگرد داغ دہلوی
زندہ اک تاریخ ہے کشمیر کی
والہانہ عشق ہے کشمیر سے
روح زخمی ہے وطن کے تیر سے
حضرتِ اقبال کے ہیں ہم نشیں
صاحب وجدان و عرفان و یقیں
فوق صاحب کی ہے سب پر فوقیت
درس و حکمت سے ہے ان کو اُنسیت

ان کی نظمیں نسخۂ اکسیر ہیں وہ حقیقی شاعر کشمیر ہیں کشمیر کے علاوہ فوق نے اپنے دور کے بعض اہم واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اپنے دور کے حالات سے متاثر ہو کر فوق نے ہنگامی نظمیں لکھی ہیں۔ ہنگامی اور سیاسی موضوعات پر لکھنے کے اعتبار سے مولانا حالی اور مولانا ظفر علی خاں ان کے پیش رو تھے فوق سیاسی اور ہنگامی شاعری کو دائمی قدر کی چیز نہ بنا سکے لیکن پھر بھی اس شاعری کی اپنی اہمیت و قدر موجود ہے۔ فوق کی نظم "اتحاد ثلاثہ اور دنیائے اسلام" ایسی شاعری کی ایک روشن مثال ہے۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء کو جب اٹلی نے ترکی کو اعلانِ جنگ دے کر دنیا کو متحیر و ششدر کر دیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اسی اضطراب سے متاثر ہو کر عنوانِ بالا پر ایک نظم لکھی جس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

چھائی ہیں کالی گھٹائیں عالمِ اسلام پر
اس میں ایراں ہو مراکو ہو کہ ترکستان ہو
نوچ کھایا حرص یورپ نے ہمارے جسم کو
کیوں نہ وقفِ کاہش و اندوہ دل اور جان ہو

اپنی کوتاہی سے پھر بڑھنے کو ہے دست دراز
اب بھی مسلم بچ رہیں قائم اگر ایمان ہو
جرمنی کو اے مثلث طاقت سچ سچ بتاؤ
آدمی ہو یا بہ شکل آدمی شیطان ہو
کیا ہوئے حفظ مساوات واخوت کے اصول
کیا تمہیں آزادی وتہذیب کی پہچان ہو

فوق ہمارے قومی شعرا میں سے ایک بڑے قومی شاعر ہیں۔ ان کے اسلوب اور فکر واظہار میں مولانا حالی' اقبال' شبلی اور ظفر کا رنگ نظر آتا ہے۔ قومی شاعری کے حوالے سے فوق کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

اب کہاں قومی چمن میں وہ بہار
اختلاف رنگ وبو نے کیا کیا
اُدھر ہے جشن تاج کامیابی
اِدھر تقدیر کو تو رو رہا ہے
تجھے مردہ سمجھ کر کیوں نہ روئیں
زمانہ جاگ اٹھا تو سو رہا ہے

نظم کے ساتھ ساتھ فوق کے ہاں غزل میں بھی قومی اور ملی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ حالی اور اقبال نے بھی غزل میں اخلاقی اور قومی مضامین باندھے ہیں۔ فوق کی جدت یہ ہے کہ انہوں نے ایسی غزل کو باقاعدہ "قومی غزل" کا عنوان دیا ہے۔ ان کی ایک قومی غزل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

ہے پھٹے کپڑوں میں پوشیدہ پریشانیٔ قوم
دل حیراں ہے آئینۂ حیرانیٔ قوم
لاج ہے پردۂ ناموس کی ستار کے ہاتھ
ننگ اسلام ہوئی جاتی ہے عریانیٔ قوم
کچھ نہیں اپنے بھلے اور برے کی پروا
کس قدر قابلِ افسوس ہے نادانیٔ قوم

کوئی حساس شاعر اپنے سماج اور معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ فوق کے یہاں سماجی اور معاشرتی مسائل جیسے موضوعات کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے کسانوں اور مزدوروں کیلئے متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں

مزدور کو خوش رکھنے سے ملتی ہیں دعائیں
ناخوش اسے رکھتا نہیں اچھا یہ قرینہ
اے صاحب سرمایہ نہیں یاد تجھے کیا
اس بارے میں کیا کہہ گئے سرکارِ مدینہ
مزدور کی جو مزدوری ہے فوراً وہ ادا کر
قبل اس کے کہ مزدور کا ہو خشک پسینہ

مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ساتھ فوق نے بدعنوانی اور رشوت کی علامت پٹواری کو بھی اپنے اشعار میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ فوق کے نزدیک رشوت لینا معاشرے کی رسم ورواج میں شامل ہے۔

پٹواری کے حوالے سے فوق کی نظم "منظوم رپورٹ" کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں

یہ مسلم ہے کہ ایسا کوئی پٹواری نہیں!
"ناس مشکہ" کی ازل سے جس کو بیماری نہیں
اور بیماری بھی پھر ایسی کہ جو ہے لاعلاج
برص کی ممکن دوا ہے کوڑھ کا کیا ہو علاج
ان کی رشوت اب رواج ورسم کی صورت میں ہے
بڑھ کے تنخواہوں سے ان کو آمدن رشوت میں ہے

فوق کا کتابچہ "سکاؤٹوں کے گیت" بارہ گیتوں پر مشتمل ہے یہ گیت بچوں اور نوجوانوں میں احترامِ انسانیت اور حبِ وطن کے مقدس جذبات واحساسات پیدا کرتے ہیں۔ یہ گیت ۱۹۲۶ء میں لکھے گئے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

کوئی کرتا نہیں شفقت نہ سہی
عیش دیتا نہیں دعوت نہ سہی
اہلِ دنیا میں مروت نہ سہی
نہ سہی ان کی عنایت نہ سہی

آؤ ہم اپنی مدد آپ کریں
کیوں پسند آئے ہمیں رسوائی
ہم پہ کیوں ہو اثرِ خود درائی
کیوں نہ قوت کی کریں یکجائی
ہم سب آپس میں ہیں بھائی بھائی
آؤ ہم اپنی مدد آپ کریں

فوق کی منظر یہ نظمیں ان کے گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی منظر نگاری قارئین کیلئے جاذب دل و نگاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کا ہر منظر متحرک اور متنفس ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "کشمیر کے ایک جنگل کا نظارہ" سے کچھ اشعار ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں

جنگل میں زندگی کا کیا لطف آرہا ہے
سبزہ ہر ایک جانب مخمل بچھا رہا ہے
اے سرزمین حمرا رونق ہو کیوں نہ تجھ میں
خود باغبانِ قدرت تجھ کو سجا رہا ہے
ہے کوہ پر الاؤ یا ژونگ کی جھلک ہے
یا چرخ پر ستارہ یہ جھلملا رہا ہے
کیا لطف دے رہی ہے ابرِ کرم کی بوندیں
ہر برگ گل نکھر کر جوبن دکھا رہا ہے

فوق نے اپنی اصلاحی شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ انداز سے بھرپور کام لیا ہے۔ اپنے گردونواح کے ماحول کی سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ فوق کا معاشرہ ایک کربناک صورتِ حال سے دوچار تھا۔ انہوں نے اپنے دور کے انسان کی بد اعمالیوں کوتاہیوں اور ناکامیوں کی نشاندہی بڑی خوبصورتی سے اپنی شاعری میں کی ہے۔ اس حوالے سے اشعار ملاحظہ ہوں

ایک وہ ہیں کہ جو اجداد کو دیتے ہیں فروغ
ایک ہم نام سلف کو جو مٹا دیتے ہیں
ایک وہ کرتے ہیں تاریکی میں پیدا تنویر

ایک ہم نور کو ظلمت میں چھپا دیتے ہیں ۱۷۲

فوق کی شاعری میں خالص مزاح کے نمونے بھی بکثرت ملتے ہیں

کہتے ہیں قصہ ترا سنتے تو سنتے کس لئے
وہ کوئی افسانہ آرائشِ محفل نہ تھا

ایک عالم دیکھ کر حیران ہے
حور کے پردے میں تو انسان ہے

فکرِ دنیا، فکرِ دیں، فکرِ مآل
کس مصیبت میں ہماری جان ہے

بھاگتا پھرتا ہوں آبادی سے میں
شاعری ہے یا کوئی خفقان ہے

فوق کی شاعری میں اخلاقی مضامین بھی بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایسی شاعری ان کی مقصدیت نوازی کا پرتو ہے۔ لہو ولعب، شراب نوشی اور عیش وتساہل کے خلاف فوق کے ہاں بہت زیادہ اخلاق آموز اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

کہاں تک دخترِ زر کی بڑھتی جائے گی یہ بدمستی
کہ آخر ہو کے وہ رسوا تری محفل سے نکلے گی

بھلائی کر جو ہے مقصود نام کی خواہش
کہ نیک کام ہی سے نیک نام ہوتا ہے

کہیں سنا ہے ملا اوجِ پست ہمت کو
کہیں رذیل بھی عالی مقام ہوتا ہے

حلال کرتے ہیں سب کو وہ بے گنہ اے فوق
نہ کیجیے غصہ کہ غصہ حرام ہوتا ہے

فوق کی زبان اور فکر دونوں میں سادگی موجود ہے جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ فوق سادہ اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کو کامیابی سے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی فکری سادگی یہ ہے کہ وہ عام معاشرتی اور اخلاقی مضامین کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں

پہلے جو تھے زمیں پر اب آسمان پر ہیں

یعنی مکان والے اب لامکاں پر ہیں
تیر و کمان پر ہیں دتیغ وسنان پر ہیں
قاتل تری نگاہیں اونچی اڑان پر ہیں
اک میں کے میرا قصہ سنتا نہیں ہے کوئی
اک تو کے تیرے چرچے سب کی زبان پر ہیں

تغزل غزل کی بنیادی خوبی ہے۔ فوق کی غزلیہ شاعری میں تغزل کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ فوق کی غزل میں فکر وخیال کے متعدد زاویے موجود ہیں اور انہوں نے ان زاویوں کو حسنِ اظہار کے متنوع اسالیب میں بیان کیا ہے اور تغزل کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آتا

کہہ نہیں سکتے زور سے کچھ ہم
بات مانو تو مہربانی ہے
انسان ہوں خمیر میں ہے نسیان
رسوا تو نہ کر اب خطا پوش
آیا بھی گیا بھی دم زدن میں
جھونکا تھا کہ تھا شباب کا جوش
اے شرمِ گنہ نہ کر کنارہ
اے رحمتِ خاص کھول آغوش

ہر شاعر اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ معاشرتی احساس ہی مقیاس فن اور معیارِ ہنر ہے۔ فوق کی غزل میں بھی گہرے معاشرتی احساس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

بتائے زورِ فہم و عقل سے راز نہاں تو نے
خدائی کی دکھائی شان مشت استخواں تو نے
کبھی سرمایہ داروں کو بھی کھینچ اپنے شکنجہ میں
غریبوں پر زمیں کیوں تنگ کر دی آسماں تو نے
چاند سورج بھی چھپے جاتے ہیں اے ابر محیط

ہند پر کیسی نحوست کی گھٹا آئی ہے
کام بے جاہیں 'عمل بد ہیں 'خیالات خراب
جو وبا آئی ہے ہم پر وہ بجا آئی ہے
آگے چل کر ابھی دیکھو گے جو ہیں فعل یہی
دہرِ پر فتنہ میں آفت ابھی کیا آئی ہے

فوق نے اپنی نظم کے ساتھ ساتھ اپنی غزل میں بھی داخلی اور ذاتی حالات تفصیلاً بیان کئے ہیں۔ فوق کے ذاتی حالات کی عکاسی زیادہ تر ان کے مقطعوں میں ہوئی ہے۔ ان اشعار سے ان کی زندگی کے کئی گوشے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

فوق پھر تیرا سخن مقبول عام کیوں نہ ہو
فیض ہو تجھ پر اگر کچھ داغ سے استاد کا
اے فوق شاعری کو ادب سے سلام کر
صورت نکال جاکے کہیں روزگار کی
انگلش زبان ہی سے جو آشنا ہو تم
اے فوق پھر ایڈیٹر اخبار کیوں ہوئے
نظم اقبال بھی بے چین تو کرتی ہے مگر
تیرے اشعار بھی اے ذوق مزا دیتے ہیں

غزل میں حمدیہ ونعتیہ اشعار کہنا اردو غزل کی مسلمہ روایت ہے۔ فوق کی بے شمار غزلوں میں حمدیہ ونعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں
باغ عالم میں عجب رنگ دکھایا تو نے

درس عرفان ورق گل میں پڑھایا تو نے
طور پر حضرت موسیٰؑ کو جو آیا تھا نظر
مجھ کو ہر رنگ میں وہ جلوہ دکھایا تو نے
یوسف مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں ترا شیدا ہو کر

مدد اے جلوہ نظارہ محبوبِ خدا
آنکھیں بے کار ہوئی جاتی ہیں بینا ہو کر

فوق کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر اقبال نے کئی بار خود بھی کیا۔ ۱۹۰۹ء میں پہلی بار جب "کلامِ فوق" شائع ہوا تو اقبال نے تاریخ نکالی اور یہ اشعار کہے۔

جب چھپ گیا مطبع میں یہ مجموعہ اشعار
معلوم ہوا مجھ کر حالِ نصر فوق
شستہ ہے زبان جملہ مضامین ہیں عالی
تعریف کے قابل ہے خیالِ نصرِ فوق
تاریخ کی مجھ کو جو تمنا ہوئی اقبال
ہاطف نے کہا لکھ دے کمالِ نصرِ فوق

فوق کی فکری شاعری میں فنی محاسن بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کا کلام عموماً صاف اور ہموار ہے جو ان کی قدرتِ کلام کا آئینہ دار ہے۔ وہ عموماً ردیف کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی ردیفیں عموماً سادہ اور مروج ہوتی ہیں۔ وہ ردیفوں سے دلفریبی کا سامان پیدا کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔

رفعتِ کہسار کی پروانہ کر
راہ ناہموار کی پروانہ کر

فوق اظہارِ فکر کیلئے سادہ تشبیہات سے کام لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تلمیحات کا حسن بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ روزمرہ اور لطافت زبان سے بھی فوق نے اپنے کلام کو خوبصورت بنایا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

پردہ برق میں رہ رہ کے چمکنے والے
ابرِ باراں کی طرح مجھ کو رولایا تو نے
یوسفِ مصر بھی گر آئے زلیخا ہو کر
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں تراشیدا ہو کر
ملتی نہیں ہے جس وفا کی طرح کہیں
"اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا؟"

مے خانہ اور شیخ بہ ایں ریش و فش چہ پوش
ہم تو بھلا تھے خیر یہ حضرت کو کیا ہوا؟

کلامِ فوق کے فنی محاسن کے متعلق اکبر الہ آبادی نے جو رائے ظاہر کی تھی وہ مجموعی طور پر ان کے پورے کلام پر صادق آتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی فوق کے کلام کے بارے میں رائے یہ ہے۔

کلامِ فوق بلاشبہ قابلِ داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہیں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلامِ فوق میں فطری آرزوئیں بھی ہیں۔ شوخی کا اظہار بھی ہے۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ رندانہ رنگ قطرہ ہائے مئے کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں اخلاقی وہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے۔ نظموں اور غزلوں کی شان نزول نے آپ کی جدت آفرینی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ محمد دین فوق نے اپنے آپ کو علم وادب کے کئی شعبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ دوسری ادبی مصروفیات کے پیشِ نظر شاعری پر پوری توجہ نہ دے سکے اس کے باوجود ان کی شاعری اپنے عہد کے حوالے سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

حبیب تنویر کا ڈرامہ "آگرہ بازار"

احمد سہیل

کلیدی لفظیات اور اصطلاحات ـــ: آگرہ بازار، سوانح عمری حبیب تنویر، نظیر اکبر آبادی، تھیٹر، انڈین تھیٹر، نیا تھیٹر، بشری تہذیب، تاریخ سازی۔ لسانی تجربات:::

آگرہ میں بازار پر افسردگی کا راج ہے اور کچھ نہیں بکتا۔ ایک کھیرا بیچنے والے کو لگتا ہے کہ اگر اسے اپنی مصنوعات کی خوبیوں کے بارے میں لکھی ہوئی نظم مل جائے تو یہ بہتر فروخت ہو گی۔ وہ کئی شاعروں سے رجوع کرتا ہے لیکن وہ اس کی درخواست کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ آخر میں وہ شاعر نظیر کے پاس جاتا ہے جو اسے فوراً پابند کرتا ہے۔ وہ کھیرے کے بارے میں نظیر کا گانا گاتا ہے اور اس کے پروڈکٹ کے لیے گاہک جمع ہوتے ہیں۔ دوسرے دکاندار -لڈو والا، تربوز والا، وغیرہ -اس کی پیروی کرتے ہیں اور جلد ہی پورا بازار نظیر اکبر آبادی کے گانوں سے گونجنے لگتا ہے۔

اس مرکزی پلاٹ کے ارد گرد ایک نوجوان آوارہ کی کہانی بنی ہے جو ایک ویگن کا پیچھا کرتا ہے اور اپنے حریف ایک پولیس انسپکٹر کے ہاتھوں انجام کو پہنچتا ہے، جسے وہ محبت کے اس کھیل میں پہلے شرمندہ کر چکا ہے۔ ٹی اے، ممبئی کے سرگرم رکن ہونے کے علاوہ، وہ ایڈیٹر اور ڈرامہ نقاد بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی کچھ اہم پروڈکشن جن میں آگرہ بازار، مٹی کی گاڑی، چرنداس چور، جن لاہور نہیں دیکھا، راجکت اور بہت کچھ شامل ہے۔ حبیب تنویر کو سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ، ڈرامہ کے لیے شیکھر سمان، ناندیکر ایوارڈ، فرنگ فرسٹ ملا۔

* نیا تھیٹر *

نیا تھیٹر حبیب تنویر نے 1959 میں قائم کیا۔ ایک پیشہ ور ٹورنگ تھیٹر کمپنی ہے جو ہندوستان کے طول و عرض کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بہت سی جگہوں پر مسلسل پرفارم کر رہی ہے۔ کمپنی کی شروعات دہلی میں ہوئی، لیکن 90 کی دہائی میں اس نے اپنا اڈہ بھوپال منتقل کر دیا۔ نیا تھیٹر کے بنیادی اداکار چھتیس گڑھ کے دیہی علاقوں کے انتہائی باصلاحیت اداکاروں اور گلوکاروں میں سے ہیں۔ تاہم، نیا تھیٹر تھیٹر کی روایتی یا دیہی شکلوں کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے -بہت اوائل سے، یہاں تک کہ گروپ کے قائم ہونے سے پہلے۔ حبیب تنویر نے زبان کے ساتھ تجربات شروع کیے تھے، اور سب سے اہم بات یہ کہ شہری اور دیہی اداکاروں کے امتزاج سے۔ تنویر اور چھتیس گڑھ کے فنکاروں کے اکٹھے ہونے کا نتیجہ بالآخر ایک منفرد تخلیق کی صورت میں نکلا۔ جدید ہندوستانی تھیٹر کا

محاورہ، جس نے 1975 میں چرنداس چور کے ساتھ ہندوستانی عوام کے تخیل کو اپنی لپیٹ میں لیا اور اس کے بعد سے اسے کبھی بھی جاری نہیں کیا گیا۔

' 'سفینہ سماوی نے اپنے ایک مضمون "اردو میں ایپک تھیٹر کا نمائندہ ڈراما "آگرہ بازار" میں لکھا ہے،

"ڈرامہ "آگرہ بازار" کو ایک کامیاب ایپک ڈراما کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایپک تھیٹر کی روایت کو تقویت بخشنے میں مذکورہ ڈراما نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ ڈراما کے تاریخی واقعات کے مستند ہونے پر چند ناقدین نے سوال اٹھائے ہیں اور نشاندہی کی ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس میں غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ 'آگرہ بازار' کوئی تاریخی دستاویز نہیں بلکہ ایک ڈراما ہے اور ڈراما کے واقعات کے لئے ضروری نہیں وہ سو فیصد حقائق پر مبنی ہوں۔ خود ڈراما نگار نے بھی ڈراما کے مقدمے میں اس بات کو قبول کیا ہے کہ کہانی من گھڑت ہے لہٰذا قصہ کے تاریخی طور سے مستند ہونے پر سوال اٹھانا غیر ضروری عمل معلوم ہوتا ہے۔ حبیب تنویر کی پوری توجہ نظیرؔ اکبر آبادی کی شخصیت کو پیش کرنے کی تھی لہٰذا انھوں نے نظیرؔ کی شاعری اور شخصیت کو ذہن میں رکھ کر ہی ڈراما ہی تخلیق کیا ہے۔ ڈراما میں اصل چیز اس کا فن ہوتا ہے واقعات کچھ بھی ہوں فنی اعتبار سے ڈراما کامیاب ہونا چاہیے ۔ایپک تھیٹر کی روایت پر 'آگرہ بازار' پورا اترتا ہے اور اس لحاظ سے 'آگرہ بازار' ایک کامیاب ڈراما ہے'(اردو ریسرچ جرنل شمارہ 20،ڈراما، دہلی)

*بحثیت ہدایت کار تنویر حبیب کا نوٹ *

یہ ڈرامہ نظیر اکبر آبادی کی انسان دوست شاعری کے گرد بُنا گیا ہے اور انسانیت پسندی اس ڈرامے کا موضوع ہے۔ نذیر، ایک حقیقی پرولتاریہ شاعر، اکثر دکانداروں اور تاجروں، بھکاریوں اور بھکاریوں کے مطالبے پر لکھتا تھا، جو کچھ لکھا تھا اسے جمع کرنے یا شائع کرنے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ ان کی بول چال اور بول چال نے انہیں اردو شاعری کے مرکزی دھارے سے کاٹ دیا۔ اس کے کام کو ان کی موت کے بعد کئی نسلوں میں ایک ادبی آدمی کے بدلے ہوئے تصادم سے 'دریافت' کیا گیا تھا جو ایک بھکاری کے گانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کی پوتی سے کچھ مواد برآمد ہوا اور اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، خیال تھا کہ اب کل کا زیادہ تر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کبھی آگرہ بازار میں نظر نہیں آتے کیونکہ اس کی زندگی کا کوئی مستند بیان دستیاب نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاعر نے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن دے کر، لکھنؤ کے نواب جیسے خیر خواہوں کی دعوتوں اور کمیشنوں سے انکار کر کے معمولی روزی کمائی۔

پتنگ بیچنے والے کی دکان جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور نذیر کی عوامی شاعری پڑھتے ہیں وہ کتاب کی دکان کے مخالف نقطہ کے طور پر کام کرتی ہے جہاں عدالتی شاعری کی اشرافیہ اقدار پر زندگی کے مرکزی دھارے کے درمیان بحث کی جاتی ہے - کمہاروں، طوائفوں، آوارہوں اور کاموں کے درمیان۔ -کچھ نہیں نذیر کی شاعری میں اس زندگی کو بہت زیادہ اور بھرپور طریقے سے دکھایا گیاہے، کتابوں کی دکان کے ماحول کو نہیں چھوتا اور وہاں جمع ہونے والے ادب سے بالکل محروم رہتاہے۔

اس ڈرامے کی کہانی انیسویں صدی کے شاعر نظیر اکبر آبادی کی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو چھوتی ہے لیکن اس کا پس منظر 1857 کے آزادی کی ناکام تحریک کے بعد کے زمانے کو بخوبی پیش کرتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی غالب سے پہلے کے دور کے اردو کے ایک بڑے شاعر تھے لیکن انہیں اپنی زندگی میں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔

پچھڑے طبقے کے لیے بھی شعر کہنے والے نظیر اکبر آبادی کا بہت سا کلام ان کے انتقال کے کئی برس بعد شائع ہو سکا۔

ڈرامے کی کہانی آگرہ شہر کے ایک بازار کی ہے جہاں ککڑی، لڈو اور تربوز فروخت کرنے والے اپنا سامان فروخت کرنے میں ناکام ہیں۔ تبھی ککڑی فروخت کرنے والے کو خیال آتا ہے کہ اگر کوئی شاعر ان کی ککڑی پر کوئی شعر کہہ دے تو شاید اس کی ککڑیاں بکنی شروع ہو جائیں۔

.....

" * آگرہ بازار "کا خلاصہ *

آگرہ بازار، حبیب تنویر کی موسیقی کا شاہکار، پہلی بار 1954 میں اسٹیج کیا گیا تھا

تھیٹر کے ایک فرد، حبیب تنویر

(1923-2005)، ایک ہدایت کار، اداکار، ڈرامہ نگار، شاعر تھے۔

اپنے ڈراموں کے ساتھ، وہ امیر ڈرامائی لایا

چھتیس گڑھ کی موسیقی کی روایات قومی اور

بین الاقوامی توجہ. میں تنویر کے کام کی انفرادیت

تھیٹر یہ تھا کہ اس نے یہ ظاہر کیا کہ ہندوستانی تھیٹر کیسے ہو سکتا ہے۔

خوشگوار روایتی اور ایک ہی وقت میں پُرجوش بنیں۔

عصری یا جدید؟ دوران اس کی شمولیت

انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کے ساتھ 1940

ترقی پسند مصنفین کی انجمن گہری اور دیرپا تھی۔

اس پر اثر. جب تنویر 1954 میں دہلی چلے گئے۔

شہر کے اسٹیج سین پر ڈرامہ گروپوں کا غلبہ تھا۔

جس نے اپنے تمام خیالات یورپی ماڈلز سے اخذ کیے ہیں۔

بعد میں 19ویں اور 20ویں صدی کے اوائل میں۔ تھوڑی سی کوشش تھی۔

تھیٹر کے کام کو مقامی روایات سے جوڑنا

کارکردگی، یا یہاں تک کہ فوری قیمت کا کچھ کہنا

ہندوستانی سامعین کے لیے۔ اس کے بالکل برعکس تنویر کا

پہلی بڑی پیداوار آگرہ بازار نے ایک تجربہ پیش کیا۔

یکسر مختلف، شکل اور مواد دونوں میں سے

کچھ بھی جو شہر نے کبھی دیکھا تھا۔

1954 میں ان کا میوزیکل ڈرامہ، آگرہ تیار کیا۔

بازار، بہت نظر انداز کیے گئے 18ویں کی زندگی پر مبنی ہے۔

صدی کے اردو شاعر نظیر اکبر آبادی۔ ڈرامہ بن گیا۔

بہترین ہندوستانی ڈرامہ نگاروں اور تھیٹر کی تاریخ میں انمٹ ہے۔

ہدایت کار: 1958 میں اس نے مٹیکیگاڈی (مٹی کی ٹوکری) لکھی، اور کہانی کو ڈرامے میں ڈھالا

سدراکا کی مریچکاٹیکا سے اور دیہی شہری کاسٹ کی ملی جلی اداکاری کی۔ اس نے اپنا شاہکار چرندا س چور لکھا

(1975)، چھتیس گڑھ کی لوک روایات میں جڑیں، اور

اپنی تھیٹر کمپنی کو چھتیس گڑھی سے بھر دیا۔

اٹھارویں صدی کے ماحول کی تنویر کی تھیٹرائزیشن جس میں نظیر رہتے تھے اور لکھتے تھے۔

"آگرہ بازار، معاصر کے طور پر واقعی اہم تھا۔

میوزیکل تنویر نے 'یوم نظیر' کے لیے ڈرامہ لکھا، منایا گیا۔

تنویر حبیب آگرہ بازار کے دیباچے میں لکھتے ہیں، "سب سے زیادہ

اس زمانے میں بے نیاز شاعر نظیر سامنے آیا

غالب سے پہلے اور میر کے بعد۔ نظیر نے نہ صرف لکھا

عام لوگ اور ان کے روزمرہ کے مسائل لیکن ایک میں لکھا

اسلوب اور محاورہ جس نے اشرافیہ کو نظر انداز کیا اور چیلنج کیا۔

شاعرانہ سجاوٹ کے اصول حوالے سے تنویر حبیب کے لیے نظیر اکبر آبادی شاعر تھے۔

لوگوں کا ان کے بارے میں لکھنا کہ ان کے مسائل کی بازگشت اور

اس کے کاموں میں اس کا ماحول اس طرح تنویر حبیب کو مل گیا۔

نظیر اکبر آبادی کے کاموں میں بے وقتیت کا معیار کے بارے میں جیسا کہ تنویر حبیب لکھتے ہیں۔۔

فنکارانہ اور تخلیقی ہدایت کار، اداکار، ڈرامہ نگار، شاعر، حبیب تنویر بہت سے رنگ چھپے ہوئے ہیں جو سب ایک رنگ میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کی متحرک شخصیت اور ہنر کو تھیٹر اور سنیما میں بہت سے لوگ یاد کرتے ہیں۔ تنویر حبیب کے ڈرامے جیسے آگرہ بازار، جس لاہور نہیں دیکھا، چرنداس چور، گاوں نام سسرال موڑ نام دماد، اور بہت سے دوسرے کو معاصر ہندوستانی تھیٹر کے کلاسک کے طور پر بڑے پیمانے پر پہچانا جاتا ہے۔

اداکار نصیر الدین شاہ نے ایک بار کہا تھا کہ وہ حبیب تنویر کی مثال ان لوگوں میں سے ایک کے طور پر پیش کرتے ہیں جنہوں نے اپنے تاریک دنوں میں بھی اداکاروں کی رہنمائی کی۔ "جب میں نئے آنے والوں کے ساتھ بات چیت کرتا ہوں، تو میرے پاس حبیب تنویر، گریش کرناڈ، اوم پوری، شیام بینیگل، ستیہ دیو دوبے جیسے لوگوں کی مثال ملتی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو وہ میرے لیے بت تھے۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے تنویر جی بہت ذہین آدمی کے طور پر یاد ہے، وہ اپنے ارد گرد موجود ہر شخص کو ہنسا دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ ہمیں پروڈکشن کے دوران اہم باتیں بہت اتفاق سے بتاتا تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب دہلی کے اندرا پرستھ کالج برائے خواتین میں آگرہ بازار کا انعقاد کیا گیا۔ اس کے پاس یہ پراسرار خوبی تھی جو ہم سب کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر کام میں مشغول رہتا لیکن ہر چیز پر گہری نظر رکھتا۔ ایسا ہی ہے کہ ان سر کا ایک چھوٹا سا جھکاؤ ایک طرف گا اور اسے معلوم ہو گا کہ

مشقوں میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کے بارے میں ہر وقت ایک توانائی رہتی تھی،" اداکار سیانی گپتا نے افسانوی ڈرامہ نگار کے ساتھ کام کرتے ہوئے اپنے تجربات کو یاد کرتے ہوئے یہ بات "دی پرنٹ" میں بتائی تھی۔

صحافی، ڈرامہ نگار، پلے پروڈیوسر، شاعر اور ہدایت کار حبیب تنویر کا نام تھیٹر کے میدان میں سب سے مشہور اور قابل احترام ناموں میں سے ایک ہے۔ وہ یکم ستمبر 1923 کو رائے پور، مدھیہ پردیش (موجودہ چھتیس گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تھیٹر کے تربیت راہداِوک تھیٹر لندن اسکول، یونائیٹڈ کنگڈم (یو کے) سے حاصل کی۔ حبیب تنویر جنہیں عام طور پر حبیب صاحب کہا جاتا تھا، 1955ء میں انگلینڈ گئے اور وہاں رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس اور برسٹل اولڈ وک تھیٹر میں ٹریننگ حاصل کی۔ اس کے بعد وہ دو سال تک یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہے اور تھیٹر کا عملی مشاہدہ کیا۔ 1956ء میں برلن میں ان کا قیام رہا۔ یہاں انھوں نے تھیٹر کی شہرہ آفاق شخصیت بریخت کے ڈرامے دیکھے اور ان سے بے حد متاثر ہوئے۔، حبیب احمد خان نے شاعری شروع کرنے کے بعد اپنا نام بدل کر تنویر رکھ لیا

1944 میں مورس کالج ناگ پور سے گریجوایشن کرنے کے بعد ایم اے کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن ایک ہی سال بعد بمبئی چلے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ بطور پروڈیوسر وابستہ ہو گئے۔ اِس شہر میں رہتے ہوئے اُنہوں نے کچھ ہندی فلموں کے لئے گیت بھی لکھے اور کچھ میں اداکاری بھی کی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔

پچاس کے عشرے میں وہ ڈرامے کی تکنیک میں تربیت کے حصول کے لئے چند برس انگلینڈ میں مقیم رہے۔ اُسی دَور میں اُنہیں جرمن شہر برلن میں قیام کا موقع ملا، جہاں اُنہوں نے ممتاز جرمن ڈرامہ نگار بیر تھولٹ بریشت کے کئی ڈرامے دیکھے۔ یہ بریشت کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد کی بات ہے۔ بریشت نے اُن کے فن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ حبیب تنویر نے تقریباً نو فلموں میں اداکاری کی، جن میں رچرڈ ایڈنبرگ کی بنائی ہوئی فلم "گاندھی" بھی شامل ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، وہ 1945 میں بمبئی چلے گئے جہاں وہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن اور پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کے ساتھ بطور مصنف، اداکار اور صحافی شامل ہوئے۔ نو سال بعد وہ دہلی چلے گئے۔، جہاں انھوں نے اپنی نے کئی بڑے اور یادگار ڈرامے پیش کیے۔

1959 میں جب تنویر حبیب نے نیا تھیٹر گروپ قائم کیا، جس نے اب چھتیس گڑھ کے مقامی قبائلی فنکاروں کی لوک پرفارمنس کا استعمال کرتے ہوئے ڈرامے تیار کیے تھے۔ ایک مصنف اور ہدایت کار کے طور پر، تنویر نے ڈرامہ، موسیقی اور کہانی سنانے میں

لوک روایات پر تحقیق کرنے میں برسوں گزارے۔ انہوں نے چھتیس گڑھ کی ملاقات اور مقامی دیہاتی فنکاروں کے ساتھ کام کرنے کے اندرونی حصے کا سفر کیا، اور اپنی پروڈکشن میں لوک موسیقی کا استعمال کیا

8 جون 2009 کو اپنی وفات تک اس کے ہدایت کار رہے۔ اپنے ابتدائی دنوں میں آئی پی ٹی اے، ممبئی کے سرگرم رکن ہونے کے علاوہ، وہ ایڈیٹر اور ڈرامہ نقاد بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی کچھ اہم پروڈکشن جن میں آگرہ بازار، مٹی کی گاڑی، چرنداس چور، جن لاہور نہیں دیکھا، راجکت اور بہت کچھ شامل ہے۔ تنویر حبیب کو سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ، ڈرامہ کے لیے شیکھر سمان، ناندیکر ایوارڈ، فرنگ فرسٹ ایوارڈ، پدم شری اور پدم بھوشن جیسے متعدد ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا۔

* خلاصہ کلام *

"آگرہ بازار" پر افسردگی چھائی ہوئی ہے اور کچھ نہیں بکتا۔ ایک کھیر بیچنے والے کو لگتا ہے کہ اگر اسے اپنی مصنوعات کی خوبیوں کے بارے میں کوئی نظم لکھنے والا مل جائے تو یہ بہتر فروخت ہو گا۔ وہ کئی شاعروں سے رجوع کرتا ہے لیکن وہ اس کی درخواست کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ آخر میں وہ شاعر نظیر اکبر آبادی کے پاس جاتا ہے جو اسے فوراً پابند کرتا ہے۔ وہ کھیرے کے بارے میں نذیر کا گانا گاتے ہوئے واپس کرتا ہے اور اس کے پروڈکٹ کے لیے گاہک جمع ہوتے ہیں۔ دوسرے دکاندار -لڈو والا، تربوز والا وغیرہ -اس کی پیروی کرتے ہیں اور جلد ہی پورا بازار نظیر کے گانوں سے گونجنے لگتا ہے۔

اس مرکزی پلاٹ کے ارد گرد ایک نوجوان آوارہ کی کہانی بنی ہے جو عدالت کا پیچھا کرتا ہے اور اپنے حریف ایک پولیس انسپکٹر کے ہاتھوں اس کا انجام تک پہنچتا ہے، جسے وہ محبت کے اس کھیل میں پہلے شرمندہ کر چکا ہے۔ یہ ڈرامہ نظیر اکبر آبادی کی انسان دوست شاعری کے گرد بُنا گیا ہے اور انسانیت پسندی اس ڈرامے کا موضوع ہے۔ نظیر اکبر آبادی ایک حقیقی پرولتاریہ شاعر، اکثر دکانداروں اور تاجروں، بھکاریوں اور بھکاریوں کے مطالبے پر لکھتے تھے، جو کچھ انہوں نے لکھا اسے جمع کرنے یا شائع کرنے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس کا کام ان کی موت کے بعد کئی نسلوں میں ایک ادبی شخصیت سے اتفاقی ملاقات سے 'دریافت' ہوا جو ایک بھکاری کے گانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کی پوتی سے کچھ مواد حاصل کیا گیا اور اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، حالانکہ کل بڑا حصہ اب ضائع ہو چکا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کبھی بھی آگرہ بازار میں نظر نہیں آتا کیونکہ اس کی زندگی کا کوئی مستند بیان دستیاب نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاعر نے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن دے کر، نواب آف لکھنؤ جیسے خیر خواہوں کی دعوتوں اور کمیشنوں سے انکار کر کے معمولی روزی کمائی۔ پتنگ بیچنے والوں کی دکان جہاں لوگ اکٹھے ہو کر نذیر کی شاعری پڑھتے ہیں۔ کتاب کی دکان کے مخالف نقطہ جہاں عدالتی شاعری کی اعلیٰ اقدار پر بحث کی جاتی ہے۔ درمیان میں زندگی کا مرکزی دھارا بہتا ہے – کمہاروں، پنساریوں، دکانداروں،

درباریوں، طوائفوں، آوارہ گردیوں اور چندوں کے ساتھ۔ نذیر کی شاعری میں یہ زندگی جس کی بھرپور اور بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے، کتابوں کی دکان کے ماحول کو نہیں چھوتی اور وہاں جمع ہونے والے ادب سے بالکل محروم رہتی ہے۔

1954 میں لکھا اور اسٹیج کیا گیا، آگرہ بازار پہلا سنجیدہ تجربہ تھا جس میں ڈرامہ اور دیہی اداکاروں کو شہری کے ساتھ مربوط کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی پروڈکشن 35 سال کی عمر میں جامعہ ملیہ کے دانشوروں - اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ساتھ قریبی اوکھلا کے گاؤں والے بھی شامل تھے۔ اس ڈرامے کو 1970 میں کچھ چھتیس گڑھی اداکاروں کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا گیا اور پھر 1976 میں ڈرامے کی موسیقی کی ساخت بنیادی طور پر وہی ہے جو 1954 میں تھی، ایک یا دو گانوں کو چھوڑ کر، خاص طور پر 'بنجارہ نامہ' جو 1970 میں متعارف کرایا گیا تھا، اور جس کی موسیقی بھنڈا کے آنجہانی حکم چند خلیلی نے ترتیب دی تھی۔ جس نے ڈرامے میں ایک فقیر کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

---

* تنویر رحبیب پر ایک نظر *

حبیب تنویر 1 آمد: 1 ستمبر 1923 – رخصت: 8 جون 2009) ہندوستانی اردو، ہندی کے سب سے مشہور ڈرامہ نگار، تھیٹر ڈائریکٹر، شاعر اور اداکار تھے۔

وہ آگرہ بازار (1954) اور چرنداس چور (1975) جیسے ڈراموں کے مصنف تھے۔ اردو اور ہندی تھیٹر کے علمبردار، وہ سب سے زیادہ چھتیس گڑھی قبائلیوں کے ساتھ اپنے کام کے لیے جانا جاتا تھا، نیا تھیٹر، ایک تھیٹر کمپنی جس کی بنیاد انہوں نے 1959 میں بھوپال میں رکھی تھی۔ اس نے نہ صرف ایک نئی تھیٹر کی زبان تخلیق کرنے کے لیے ناچا جیسی دیسی پرفارمنس فارمز کو شامل کیا، بلکہ چرنداس چور، گاؤں کا نام سسورال، مورنام داماد اور کامدیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا جیسے سنگ میل ڈرامے بھی تخلیق کئے۔۔ حبیب تنویر آخری عمر میں اپنی سوانح عمری لکھ رہے تھے جو اب نامکمل رہ گئی ہے۔ شاید ان کا کوئی عقیدت مند اسے مکمل کر دے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ایک عظیم فن کار کی زندگی کی کہانی اکثر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اس کا چھوڑا ہوا کام کوئی اور آگے بڑھاتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی جسمانی پیکر کی بجائے انسانی آرزو کی شکل میں زندہ رہتی ہے۔

حبیب تنویر جن کا 86 سال کی عمر میں تنفس کے عارضے میں 8 جون 2009ء بروز پیر کو ان کی وفات ہوئی، حقیقی معنوں میں ایک ممتاز اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تھیٹر کو اپنی زندگی بنالیا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ خود تھیٹر کی زندگی بن گئے تھے۔ حبیب تنویر کو بھوپال کے نیشنل ہاسپٹل میں نمونیا اور سانس کی تکلیف کے سبب داخل کرایا گیا تھا۔ جہاں وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

تنویر حبیب کے ڈرامے اور فلمیں

ڈرامے

آگرہ بازار (1954)

شترنج کے مہرے 1954

لالہ شہرت رائے 1954

مٹی کی گاڑی 1958

گاوں کے ناون سسرال، مورناون دمند 1973

چرنداس چور (1975)

اترام چرتر 1977

بہادر کلارین 1978

پونگا پنڈت (1960)

ایک عورت ہائپاتھیا بھی تھی (1980 کی دہائی)

جس لاہور نہیں دیکھا (1990)

کامدیو کا اپنا بسنت ریتو کا سپنا 1993

ٹوٹا ہوا پل 1995

زہریلی ہوا 2002

راج رت 2006

کارتوس

دیکھ رہے ہیں نیان

ہرما کی امر کہانی

انہوں نے بسنت ریتو کا سپنا، شاجاپور کی شانتی بائی، مٹی کی گاری اور مدراخساس کے اپنے ورژن بھی پیش کیے

فلمیں

راہی (1952)-رامو

فٹ پاتھ 1953

چرنداس چور (1975)

(گیت اور اسکرپٹ)

اسٹیئنگ آن (1980) (ٹی وی) -ڈاکٹر مترا

گاندھی (1982) -ہندوستانی بیرسٹر

کماون کے آدم خور (1986) (ٹی وی) -بہادر

یہ وہ منزل تو نہیں (1987) -اختر بیگ

ہیر وہیر الال (1988)

پرہار: دی فائنل اٹیک (1991) -جوڈی سوزا، پیٹر ڈیسوزا کے والد

برننگ سیزن (1993) -راجہ صاحب

سردار (1993)

منگل پانڈے: دی رائزنگ (2005) -بہادر شاہ ظفر

بلیک اینڈ وائٹ (2008)

- قاضی صاب (آخری فلم کا کردار

احمد سہیل مع دو تصاویر

عساکر میں نعت کا ابتدائیہ اور افواجِ پاکستان کے نعت گو

شاکر کنڈان (سرگودھا)

فوج اور نعت اگر چہ دو مختلف موضوعات ہیں لیکن یہ دونوں موضوع جا بتداء سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ فوج کو ہم عسکریت سے منسلک کرتے ہیں اور عسکریت کو ہتھیاروں کے استعمال سے سے۔

ماہرینِ لسانیات یا علمائے تاریخ کا کہنا ہے کہ پانچ ہزار سال قبل مسیح سے پہلے کی تاریخ ہماری معلومات سے اوجھل ہے لیکن انسانی وجود کو وہ کروڑوں سال پر محیط بتاتے ہیں۔ اگر اس مفروضے کو مان بھی لیا جائے تو پھر بھی ہمیں اسی دور سے تاریخ و تہذیب کے آغاز کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جو ہماری تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ میری سمجھ سے تو یہ بالا ہے کہ ہم مفروضوں کو سچ ماننے میں تو تاخیر نہیں کرتے لیکن سچ کا سامنا کرتے ہوئے ہماری جان جاتی ہے۔

دراصل جو معلوم تاریخ ہمیں پانچ ہزار سال قبل مسیح ملتی ہے یہ وہ ہے جس کے بارے میں توریت ہماری رہنمائی کرتی ہے یا پھر قرآنِ مجید فرقانِ حمید ہمیں آگاہ فرماتا ہے۔ یہاں پانچ ہزار سال کو ماننے کے لئے تو ہم تیار ہیں لیکن اسلام کی دی ہوئی باقی آگاہی سے ہم آگاہ ہونا ہی نہیں چاہتے کیوں کہ ہمارے ذہنوں پر دوسروں کے علم کا بھوت اس حد تک سوار ہو چکا ہے کہ ہمیں اپنی ذات پر اعتماد ہی نہیں رہا۔ دوسروں کی لغویات کو ہم نے سچائی کے مقام پر فائز کر دیا اور اپنے حقائق کو تسلیم کرنے سے اس لئے قاصر رہے کہ ہم تحقیق سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

توریت کے بابِ پیدائش میں پہلا انسان حضرت آدمؑ کو تسلیم کیا گیا ہے اور قرآنِ مجید میں بھی آدم ہی جنت سے نکال کر زمین پر بھیجے جانے والے پہلے انسان قرار پاتے ہیں۔ ہم دوسروں کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے کبھی آدم کے معنی لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی آپ سے پہلے کئی اور آدموں کے وجود کی کہانی لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب کی ان تاویلات کا نہ تو کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی کوئی پر مغز دلیل۔

بہر حال حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل میں سے قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل میں استعمال ہونے والا ہتھیار ایک پتھر کا ذکر ہمیں قرآن مجید اور بائبل میں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ بائبل یا ما قبل کے دیگر صحائف اصلی حالت میں موجود ہیں یا نہیں۔ ہمیں ان کتب کے نزول اور ان کے ہونے پر ایمان لانا ہے۔ اب وہ کس حالت میں ہیں ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ اگر تحریف سے وہ صحائف دس فیصد بھی محفوظ رہ گئے ہیں تو اس قدر تو ہمیں دیکھنا ہے کہ ممکنات میں کچھ تو ہو سکتا ہے اور توریت کے بابِ پیدائش میں جو عمروں کا تناسب دیا گیا ہے یا جو افتراق ہے ان کی جمع تفریق سے حضرت آدمؑ کے زمین پر وجود کی عمر ۵۵۱۷ سال قبل مسیح بنتی ہے جسے جب معلوم تاریخ پر منطبق کیا جاتا ہے تو علمائے تاریخ کے پانچ ہزار سال تقریباً درست

ثابت ہوتے ہیں۔ قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کے بعد خیر اور شر کی جنگ جاری رہی حتیٰ کہ حضرت نوحؑ (۳۸۶۲ قم) کی نبوت کے دوران طوفان کا عذاب نازل ہوا اور سب کچھ بہا کر لے گیا (مؤرخین کے جغرافیائی حدود کے اختلاف کے قطع نظر)۔ اس کے بعد ایک نئی تاریخ اور نئی تہذیب نے جنم لیا۔ اس سے قبل لوہا دریافت ہو چکا تھا اور لوہے کو ڈھال کر ہتھیار بنانے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ نئی تہذیب میں میسوپوٹیمیا اور مصر کی آپس میں لڑائیوں کے دوران قبائل یا کنبے اپنے سردار کی سربراہی میں جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ سومیریوں نے پہلی بار لازمی فوجی خدمت کا نظام نافذ کیا

یہاں تک تو فوج کی شروعات کا احوال تھا۔ نعت کی ابتدا کو اگر ہم اسی حوالے سے دیکھیں تو سیرت النبی کی کتابوں نیز تاریخِ اسلام جسے آج ہم تاریخِ عالم کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ جب جنت سے نکل کر اِس زمین پر اترے تو انہوں نے پائے آسمان پر ایک کلمہ لکھا ہوا دیکھا۔ وہ تھا:

لا الہٰ الا اللہ محمد الرّسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

گویا یہ پہلی نعت تھی لیکن جب ہم منظوم نعت کے آغاز کی بات کرتے ہیں تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کی ولادت سے ایک ہزار یا آٹھ سو سال پہلے جب یمن کا حکمران تبع الحمیری مکہ مکرمہ سے ہوتا ہوا یثرب (بعدہ مدینۃ المنورہ) پر حملہ آور ہوتا ہے اور محاصرہ کرنے کے بعد خوراک کی کمی ہونے پر محصورین کی جانب سے مہمان نوازی پر حیران ہو کر المختصر یہ اشعار لکھتا ہے

شہدت علیٰ احمد انہ ُ نبی من اللہ باری النسم
فلو مدّ عمری الیٰ عمرۃٍ لکنت وزیرلہ ُ وابنِ عم
وجاہدت ُ بالسیف اعداءَۃ وفرجت عن صدر کل ّ غم
لہ ُ امۃ ٌ سمیت فی الزبور لہ ُ امۃ ٌ فیہ خیر الامم

......

ویاتی بعدہ ُ رجل عظیم نبی ٌ لا یرخص ُ فی الحرام
یسمیٰ احمد یالیت انی اعمّر بعد مبعث بعام

ترجمہ: میں نے نبوتِ احمد ﷺ کی گواہی دی کہ وہ اللہ کی طرف سے سچے (نبی برحق) پیغمبر ہیں۔
اگر میں اُن کے زمانۂ بعثت تک زندہ رہا تو ان کا وزیر (مددگار) بنوں گا اور چچیرا بھائی۔
اور اُن کے دشمنوں کے ساتھ تلوار سے جہاد کروں گا اور اُن کے سینے سے ہر غم دور کر دوں گا۔

اُن کی امت کا تذکرہ زبور میں آیا ہے۔ جس میں خیر الامم کہا گیا ہے۔

.....

ان کے بعد ایک عظیم آدمی آئے گا یعنی ایسا نبی جو حرم کی حرمتوں کو پامال نہیں کرے گا۔

اس کا اسم گرامی احمدؐ ہو گا۔ اے کاش میں اس کی بعثت کے ایک سال بعد تک زندہ رہوں۔

تاریخ میں حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں یہ اشعار تا حال اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد نعت تو گاہ گاہ کہی جاتی رہی لیکن عہدِ نبوی میں شعر کہنے ولوں کی تعداد ڈاکٹر عبدالحمید ندوی کے مطابق پانچ سو کے لگ بھگ تھی ان میں سے مسلم اور غیر مسلم ہر دو شعرا نے نعت شریف کہنے کا شرف حاصل کیا۔ ڈاکٹر شاہ محمد کے مطابق صرف حضور نبی کریم ﷺ کے خاندان میں کم و بیش سینتیس(۳۷)افراد شاعر تھے۔ ان میں سے سترہ(۱۷) مرد اور بیس(۲۰) خواتین تھیں۔ آپ ﷺ کے ساتویں نمبر کے دادا کعب بن لوئی اور ان کے بھائی سامہ بن لوئی دونوں شاعر تھے۔ ان دونوں کا عہد بعثت سے پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) سال پہلے کا ہے۔ اِن میں کعب بن لوئی کی نعت تاریخ میں محفوظ ہے۔ پھر آپ کے دادا کے پر دادا قصی بن کلاب کی نعت بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ کے دادا عبد المطلب، آپ ﷺ کے چچاؤں میں سے حضرت عباسؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت ابو طالب، حضرت زبیر اور چچا زاد بھائیوں میں حضرت علیؓ، عبد المطلب، حضرت عقیلؓ، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت عبداللہؓ بن زبیر بن عبد المطلب، ابو سفیان بن حارث، عبیدہ بن حارث، نوفل بن حارث اور حضرت عبداللہؓ بن عباس۔ ان سترہ مردوں میں سے اکثریت ایسے شعرا کی ہے جو صاحبِ سیف بھی تھے اور انہوں نے نعتِ رسول ﷺ بھی کہی۔ اور عہدِ نبوی میں جب عساکرِ اسلام کے شعرا کا جائزہ لیتے ہیں تو حضرت حسانؓ بن ثابت کے علاوہ تمام شعرا مردِ میدان بھی دکھائی دیتے ہیں اور توصیفِ نبیٔ اکرم ﷺ میں روایت کا حصہ بھی۔

حضرت جبریلؑ آخری بار حضور ﷺ کے پاس اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ آپؑ جہاں ایک معزز اور افضل فرشتہ تھے وہیں آپؑ کی ایک نعت بھی تاریخ و سیّر کی کتب میں ملتی ہے اور جہاں تک آپؑ کے صاحبِ سیف ہونے کا تعلق ہے تو جنگِ بدر میں جو تین ہزار فرشتے حضور ﷺ (اسلامی فوج) کی مدد کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھیجے تھے اُن میں سے ایک ہزار کے دستے کی قیادت آپؑ فرما رہے تھے۔ نعت کا یہ سفر عرب کے عسکری شعرا سے نکل کر عجم میں آتا ہے اور پھر برِ صغیر میں پہنچ کر ورفعنالک ذکرک کی تفسیر بن جاتا ہے۔

میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں آج تک اس بات پر اتفاق ہے کہ پہلی نعت ایک عسکری نے کہی تھی وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ لفظ نعت کا مادہ بھی پہلی بار ایک عسکری نے ہی استعمال کیا۔ اور یہ تھے حضرت علیؓ۔ آپؓ نے حضور خاتم النبیین ﷺ کا مکمل حلیۂ اقدس بیان کرتے ہوئے اپنے لئے ناعت کا لفظ استعمال کیا جو "نعت" کا اسمِ فاعل ہے۔

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ، جامع ترمذی میں حضرت ابراہیم بن محمد بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ ٗ سے ایک حدیث نقل کی ہے ۔ یہ حدیث حضرت ابراہیم نے اپنے دادا حضرت علیؓ کی زبانی بیان کی ہے ، جس میں حضور پُر نور حضرت محمد ﷺ کے شمائل، اوصاف اور حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔ حدیث چوں کہ طویل ہے اس لئے صرف وہ چند الفاظ جن میں حضرت علیؓ نے اپنے لئے لفظ نعوت استعمال کیا ہے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

"یَقُوْلُ نَاعِتُہٗ لَمْ اَرَ قَبْلَہٗ وَلَا بَعْدَہٗ مِثْلَہٗ ﷺ" [۱]

ترجمہ (آپ ﷺ کا وصف بیان کرنے والا کہتا ہے میں نے آپ جیسا نہ آپؐ سے پہلے اور نہ بعد میں کوئی دیکھا ہے۔)

صاحبِ سیف و قلم کی نعت گوئی جزیرۃ العرب سے نکل کر ایران سے ہوتی ہوئی برِ صغیر میں داخل ہوتی ہے ۔ یہاں بھی اُسے حضرت نظام الدین اولیاء اور بابا فرید الدین گنج شکر کے بعد ایک عسکری شخصیت لے کر آگے بڑھتی ہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اُن کی نعتیں

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

اور

زہے روشن زرویت چشمِ بینش : وجودِ کیمیائے آفرینش

ہر مسلمان کے لبوں سے ادا ہوتی ہوئی سنی جاتی ہیں۔ یہ شخصیت امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کے نام سے نہ صرف اپنی پہچان بناتی ہے بلکہ کئی علوم میں اپنا لوہا بھی منواتی ہے ۔ آپ بلبن کے عہد سے محمد تغلق کے عہد تک عسکری خدمات انجام دیتے رہے [۲]۔

فارسی سے نعت کی روایت اردو میں داخل ہوئی۔ اردو میں نعت کو بہت فروغ ملا جس میں فوج سے تعلق رکھنے والے شعرا نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور تقسیمِ ہند پر مسلمانوں نے جب اپنے لئے الگ ریاست قائم کی تو عسکری نعت گو شعراء بھی حصہ بقدرِ جثہ اس مملکت میں شامل ہو گئے۔ سو ہم یہاں عسا کرِ پاکستان میں نعت گوئی کی روایت کو چار ادوار میں تقسیم کر کے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے دور میں ان شعرا کا ذکر مقصود ہے جو قیامِ پاکستان سے قبل کسی نہ کسی عہدے پر فوج کا حصہ رہے لیکن تقسیم پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی فوج سے سبک دوش ہو گئے۔ دوسرے حصے میں وہ نعت گو جو قیامِ پاکستان سے قبل سبک دوش تو ہوئے لیکن پاکستان کے نقشے پر ابھرنے کے بعد دوبارہ پاک فوج کو جوائن کیا۔ تیسرے وہ اہلِ سخن جو تقسیمِ ہند سے پیشتر برطانوی فوج کا حصہ تھے اور اپنی ملازمت کو جاری رکھتے ہوئے افواجِ پاکستان میں شامل ہوئے اور اپنی خدمات جاری رکھیں۔ چوتھا طبقہ ان شعرا پر مشتمل ہے جنھوں نے پاکستان کے وجود کے بعد پاک فوج میں شمولیت اختیار کی۔[۳]

پہلے حصے کے شعراء میں شامل ہیں، لیفٹیننٹ مولانا ظفر علی خان جن کے شعری مجموعوں میں اگرچہ بہت سی نعتیں شامل ہیں لیکن الگ سے جو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آیا وہ ہے "ظفر علی خان کی نعت" یہ مجموعہ آپ کی وفات کے کافی عرصہ بعد پروفیسر جاوید اقبال نے ترتیب دیا اور ماہنامہ نعت لاہور کے پلیٹ فارم سے راجا رشید محمود نے اسے شائع کیا۔ صوبیدار اے ڈی طالب (اللہ دتا طالب) کا نعتیہ مجموعہ "انوارِ طالب" کے نام سے شائع ہوا۔ صوبیدار میجر عزیز جے پوری کا نعتیہ مجموعہ "نغمۂ عندلیب"، حوالدار مولانا عبد الغفور اسلم جالندھری "عقیدت کے پھول"، حوالدار باقی صدیقی "زادِ سفر"، سپاہی قصری کان پوری "نورِ ازل"، سپاہی لالۂ صحرائی کے تقریباً بارہ نعتیہ مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام ہیں: بارانِ رحمت، لالہ زارِ نعت، قصیدہ نعتیہ، نعت ستارے، نعت ہلارے، نعت دھنک، پھولوں کے پھول، نعت چراغاں، نعت سویرا، نور پرے، نعت شفق، لالۂ صحرا۔ پائیلٹ افسر خواجہ ریاض الدین عطش "وردِ نفس" اور ایئر مین قمر صدیقی کا مجموعۂ نعت "حرف حرف روشنی"

دوسرے دور کے شعراء میں سید ضمیر جعفری (یکم جنوری ۱۹۱۶ء۔ ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء) جو تقسیمِ ہند سے قبل کیپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ بعد پاکستان آرمی میں شمولیت اختیار کی اور میجر کے عہدے سے پنشن پائی۔ آپ کی ۵۶ کے لگ بھگ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "نعت نذرانہ" آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے جب کہ "ارمغانِ ضمیر" حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔

وہ جس نے آدمی پر چاند سورج کے سفر کھولے : وہ جس نے سب سے پہلے بند دروازوں کے در کھولے

سپاہی نادر شاہ (۳ مارچ ۱۹۲۴ء) ۱۹۴۴ء میں برطانوی فوج میں بھرتی ہوئے لیکن قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۷ء میں اسے خیر باد کہہ دیا۔ جہادِ کشمیر کے باعث دوبارہ ۱۹۴۹ء میں پاک فوج کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور تین سال تک عسکری فرائض انجام دیئے۔ آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں سے "حسنِ ازل" میں آپ کا نعتیہ کلام ہے۔

ماسٹر وارنٹ افسر رحمان کیانی (۳۰ اگست ۱۹۲۴ء۔ فروری ۱۹۹۰ء) ۱۹۴۳ء میں رائل انڈین ایئر فورس میں ایئر مین بھرتی ہوئے۔ آپ جنگِ عظیم دوم کے ختم ہوتے ہی فوج سے الگ ہو گئے لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے پر ۱۹۴۹ء میں

پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۷۴ء تک اس سے وابستہ رہے۔ اگرچہ آپ کے سات شعری مجموعوں میں اکثر کلام نعتیہ ہے لیکن ''شمشیر ضیا بار'' میں آپ کا نعتیہ رزمیہ کلام شامل ہے۔ آپ کی ایک نعتیہ مسدس نبی الملاحم سے ایک بند ملاحظہ ہوں:

توپ و تفنگ و دشنہ و خنجر، صلیبِ دار : ڈرتے نہیں کسی سے محمد کے جاں نثار
ماں ہے ہماری اُمِ عمارہ سی ذی وقار : ہم ہیں ابو دجانہؓ و طلحہؓ کی یادگار
ہاں! مفتی و فقیہہ نہیں، مان لیتے ہیں
ناموسِ مصطفی ﷺ پہ مگر جان دیتے ہیں

آپ کو شاعرِ رزم اور شاعرِ جہاد کے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

سارجنٹ جاوید فتح محمد (۱۰/ اکتوبر ۱۹۲۶ء۔ غالباً ۲۰۱۵ء) کا اصل نام محمد فتح تھا اور اسی نام سے آپ متحدہ ہندوستان میں بری فوج میں بھرتی ہوئے لیکن چند ہی سال بعد بقول اُن کے صحت کی خرابی کی بنا پر ملازمت چھوڑنا پڑی قیامِ پاکستان کے بعد دوبارہ جاوید فتح محمد کے نام سے ایئر فورس میں بھرتی ہوگئے۔ آپ کی تقریباً ۱۴ کتب شائع ہوئیں۔ جن میں ''گنبدِ خضریٰ'' بزبانِ پنجابی اور ''مقصودِ کائنات'' اردو زبان میں نعتیہ مجموعے ہیں۔

صوبیدار محمد افضل تحسین (۱۹۲۷ء۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء) رائل انڈین آرمی میں سپاہی کی حیثیت سے ۱۹۴۳ء میں بھرتی ہوئے۔ لیکن والدین چوں کہ اس کے مخالف تھے لہٰذا اُن کے ایما پر یہ ملازمت چھوڑ دی۔ وجودِ پاکستان کے بعد دوبارہ فوج میں شامل ہوئے اور ایجوکیشن کور سے پنشن پائی۔ آپ نے بہت لکھا اور کئی فرضی ناموں سے لکھا، جیسے فلائٹ لیفٹیننٹ ظفر اقبال قریشی، لیفٹیننٹ کمانڈر خضر اقبال، ظفر اقبال، خضر خضری، وغیرہ آپ کی وفات کے کافی عرصہ بعد راقم نے اُن کی حمد و نعت کا مجموعہ ''افضل تحسین کی حمد و نعت نگاری'' کے عنوان سے شائع کیا۔ افضل تحسین کی ایک نعت کے دو اشعار:

ممکن ہے کہاں مدحتِ سرکارِ دوعالم ﷺ: ہے حق پہ عیاں عظمتِ سرکارِ دوعالم ﷺ
مومن بھی ثناخواں ہیں فرشتے بھی ثناخواں: خود حق بھی کرے مدحتِ سرکارِ دوعالم ﷺ

تیسرے طبقہ کے شعراء میں سب سے پہلا نعتیہ مجموعہ جو ملتا ہے وہ ہیں لاہور کے باسی میجر محمد عاشق (۱۷/ اگست ۱۹۱۶ء)۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں جونیئر کمشنڈ افسر کی حیثیت سے رائل انڈین آرمی کو جوائن کیا۔ ۱۹۴۵ء میں آپ کو رائل انڈین آرمی میں کمشن ملا۔ آپ نے ۱۹۵۸ء میں پاکستان آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی لیکن ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی دونوں پاک بھارت جنگوں میں آپ نے حصہ

لیا۔ ''جنونِ زار'' آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''غالب پی ٹی کورس پر ''مزاحیہ نثر اور ''عقیدت کے پھول'' آپ کی نعتوں کا مجموعہ ہے جو غالباً قیامِ پاکستان کے بعد کسی پاکستانی فوجی کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔

شاہراہِ آگہی کو کشادہ بنادیا : بے لوث و مہر و لطف و مروت کا راستہ

انسانیت کو سیرتِ اقدس سے مل گیا : تقویٰ و زہد و کاوش و محنت کا راستہ

اسی دور میں ایک اور شخصیت جو بہت ہی مختصر عرصے کے لئے فوج کے منظر نامے میں سامنے آئی اور پھر ہمیشہ کے لئے پالیس کو اپنی خدمات پیش کر دیں وہ ہے پاکستان پولیس کے انسپکٹر جنرل چوہدری فضل حق (۱۱ فروری ۱۹۲۴ء۔ ۶ فروری ۲۰۱۴ء)۔ آپ رائل آرمی آرڈننس کور میں نائب صوبیدار کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں جب کہ آپ صوبیدار تھے ایجوکیشن کور میں کمشن حاصل کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں سکول آف آرمی ایجوکیشن مری میں کورس پر بھیجے گئے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں ابھی ٹریننگ ہی کر رہے تھے کہ آپ کو پولیس میں منتخب کر لیا گیا۔ آپ کے سات شعری مجموعے ''آہنگِ حجاز''۔ ''میر عرب''۔ ''نمِ صحرا''۔ ''سوئے حرم''۔ ''خارِ مژگاں''۔ مثنوی مولا علی'' اور ''سورج'' شائع ہوئے۔ ان تمام میں اگرچہ نعتیہ کلام شامل ہے لیکن اوّل اوّلذ کر چاروں مجموعے نعتیہ ہیں۔ آپ کی نعت کو مختصر نمونہ:

لب پہ آیا ہے ترا نام رسولِ عربی ﷺ : ہیں معطر دہن و کام رسولِ عربی ﷺ

میں ہوں دامانِ شب و روز پہ اک نقشِ جمیل : تو ہے کونین کا انجام رسولِ عربی ﷺ

سپاہی سلیم اختر فارانی (۱۹۲۸ء۔ ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء) دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر رائل لیکٹریکل مکینیکل انجینئر کور میں بھرتی ہوئے۔ قیامِ پاکستان پر ۵۰۹ ای ایم ای ورکشاپ الہ آباد سے آپ کی خدمات ۵۰۱ ورکشاپ راول پنڈی کو دے دی گئیں۔ جہاں سے کچھ ہی عرصہ بعد آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی اور گوجراں والا میں جہاں آپ کا خاندان ہجرت کر کے آباد ہوا تھا رہائش اختیار کی۔ آپ کے تین نعتیہ مجموعے ''نغمۂ فاراں''، ''ضیائے ہفت رخشاں'' اور ''عودِ گلستانِ رسول ﷺ'' منظرِ عام پر آئے۔

نہیں ہے انؐ سا مشفق کوئی بھی سارے زمانے میں : سراپا مہر رخشاں ہیں جہاں میں جلوتِ ہستی

انہیؐ کی ذات سے قائم ہے شرفِ نوعِ انسانی : ملی ہے ابنِ آدم کو شکوہِ شوکتِ ہستی

افواجِ پاکستان کے نعت گو شعراء کی روایت کے چوتھے درجے میں وہ نعت گو شامل ہیں جو خالصتاً جیشِ پاکستان کا حصہ ہیں۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا جتنا عرصہ بھی گزارا وہ پاکستان کی افواج میں ہی گزارا۔

میجر یوسف رجا چشتی (۶ ستمبر ۱۹۲۸ء۔ ۲۸/ اگست ۲۰۰۷ء) نے ۲۷ سال کا عرصہ پاکستان آرمی کی سگنل کور میں گزارا۔ آپ کا خاندانی نام ارباب محمد یوسف تھا۔ احمد فراز، محسن احسان اور یوسف رجا چشتی میں بچپن سے ہی گاڑھی چھنتی تھی۔ آپ نے اپنی

زندگی میں ایک ہی شعری مجموعہ "لوقسم اٹھاتے ہیں" شائع کروایا لیکن آپ کی وفات کے بعد آپ کا نعتیہ مجموعہ "عقیدتیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔

پنجابی کے شیکسپیئر وارث شاہ کے گرائیں حوالدار امان اللہ خان المعروف اجمل جنڈیالوی (۵/اکتوبر ۱۹۳۰ء۔) میٹرک کرنے کے بعد فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے اور ریٹائرمنٹ تک ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ ابتدا میں غزل لکھی لیکن بعد میں نعت کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ یہ الگ بات کہ صرف ایک نعتیہ مجموعہ "شکولِ ادراک" ہی شائع ہو سکا۔ عروض میں ماہر تھے اور بقول آپ کے رموزِ ادب مولانا عبدالحق سے سیکھے۔ مختلف رسائل میں آپ کا بہت سارا کلام بکھرا پڑا ہے۔

پنجابی کے چھاچھی لہجے اور اردو کے شاعر وارنٹ افسر غلام ربانی فروغ بھی ادب کے ان مسافروں میں سے ہیں جنہوں نے دورانِ ملازمت اردو اور پنجابی لٹریچر میں ماسٹرز کی ڈگریاں لیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد تدریس کے شعبے سے خود کو وابستہ کیا، ایئر میں سے سکبدوشی تک چوبیس سال ایئر فورس کو دیئے۔ "وساں رہوے گراں" پنجابی شعری مجموعہ اور "حرفِ نیاز" آپ کا اردو نعتیہ کلام ہے۔

مفسرِ قرآن، مذہبی پیشوا، ایک صوفی اور تنظیم الاخوان کے امیر سپاہی مولانا محمد اکرم اعوان (۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء۔۷ دسمبر ۲۰۱۷ء) نے میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج چکوال میں داخلہ ہی لیا تھا کہ خاندانی دشمنیوں کے باعث فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ شاید اُن کو کسی اور مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور پھر وہ ملازمت کو خیر باد کہہ کر سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ اللہ یار خان کی بیعت کر کے تبلیغ کے لئے وقف ہو گئے۔ آپ نے دارالعرفان منارہ کو رشد و ہدایت کا مرکز بنالیا۔ آپ نے عربی، انگریزی اور اردو میں چالیس کے لگ بھگ نظم و نثر کی کتب تصنیف کیں۔ ان میں "حمد و نعت" اور "متاعِ فقیر" آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔

کرنل سید مقبول حسین (یکم جون ۱۹۴۲ء) نے ۱۹۶۲ء میں سگنل کور میں کمشن حاصل کیا اور ۳۱ سال کی خدمات کے بعد سبک دوش ہوئے۔ آپ کی خدمات کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو تمغۂ امتیاز سے بھی نوازا۔ اردو میں آپ کی تقریباً تین نثری کتب اور آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں "عشقِ محمد ﷺ" آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ خانۂ خدا اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے بعد مختلف رسائل میں آپ کی اکثر نعتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

برِ صغیر کے معروف شاعر ناطق بدایونی کے فرزند سکواڈرن لیڈر فیروز ناطق خسرو (۱۹ نومبر ۱۹۴۴ء) اردو اور تاریخِ اسلام میں ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ تدریس سے وابستہ رہے اور پھر ایئر فورس میں کمشن لے کر ایک مدت تک عسکری خدمات انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنی تمام نگارشات کو کتابی صورت میں

منظرِ عام پر لے آئے۔ آپ کی اب تک سات کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ''ہزار آئینہ'' آپ کا مجموعۂ حمد و نعت ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

متاعِ اہلِ بصیرت جو ہے وہ ایک کرن : حضورؐ آپ کے سینے کے بیچ سے نکلی
چہار سمت ہے جاری ابھی بھی اس کا سفر : وہ رہگزر جو مدینے کے بیچ سے نکلی

تعلیم سے حد درجہ محبت کرنے والا شخص سپاہی محمد اصغر اعجاز (۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء) میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں سپاہی بھرتی ہوا اور اپنا سارا وقت کتاب کو دان کر دیا۔ پندرہ سالہ مدتِ ملازمت کے بعد اگرچہ آپ سپاہی ہی سبکدوش ہوئے لیکن آپ کے پاس ایم اے اردو، ایم اے اسلامیات، ایم اے سیاسیات، ایم اے تاریخ، ایم اے پنجابی اور بی ایڈ کی ڈگریاں موجود تھیں جب کہ بقول آپ کے مختلف اصناف اور موضوعات کی نصف درجن کے لگ بھگ کتابیں بھی آپ کی شائع ہو چکی تھیں اور اب جن کی تعداد ڈیڑھ درجب کے لگ بھگ ہے۔ ''سراج منیر'' آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے۔

چیف وارنٹ افسر محمد ساجد ڈھلوں نوری (۱۹۵۰ء) نے ایف اے کیا اور پاکستان ایئر فورس میں ایئر مین کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی۔ ریٹائر منٹ کے بعد نارووال سے لاہور منتقل ہوئے اور اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کی لئے اردو اور پنجابی زبانوں میں اسلامیات اور نعتِ سرورِ کونین ﷺ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب تک آپ کی تقریباً آٹھ کتب نثر اور نظم میں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو میں ''صراط'' ''نجات'' اور ''معراجِ محبت'' اور پنجابی میں ''سوہنے دیاں گلاں'' آپ کے معروف نعتیہ مجموعے ہیں۔

راقم الحروف کیپٹن عطار سول المعروف شاکر کنڈان (۲۰ جون ۱۹۵۱ء) میٹرک کے بعد پاک فوج میں سپاہی کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ اٹھارہ سال رینک میں گزارنے کے بعد کمشن حاصل کیا۔ ریٹائر منٹ کے بعد یونیورسٹی آف سرگودھا میں تقریباً دس سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈر ہونے کے علاوہ پینتیس تصانیف و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ''نغمۂ محمدی سے نکلی آب جو'' نعتیہ مضامیں اور ''خلعتِ توقیر'' نعتیہ مجموعۂ کلام ہے۔

عسکریت کو شعری ہیئت میں ڈھالنے والے نائیک محمد اکرم باجوا (یکم جنوری ۱۹۵۲ء) فوج میں سپاہی بھرتی ہوئے۔ فاضل اردو کے بعد آپ نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور مقررہ مدتِ ملازمت پوری ہونے کے بعد سبک دوشی اختیار کی۔ بعد ازاں وہاڑی کے ایک نجی کالج میں لیکچرر شپ اختیار کر لی۔ اردو اور پنجابی میں ایک درجن سے زائد کتب آپ تصنیف و تالیف کر چکے ہیں جن میں نثر کی زیادہ اور نظم کی کتب کم ہیں۔ ''قلم سے روشنی پھوٹے'' کے نام سے آپ کا نعتیہ کلام کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا نعتیہ اسلوب ملاحظہ فرمایئے:

حوصلے سرکارؐ کے دیکھے ہیں کائنات نے : شعبِ بوطالب کے اُس محصور کے مہمان کے

آپؐ شہر علم ہیں اور دانش و حکمت کا باب : آپ ﷺ وہ امی ہیں جو تلمیذ ہیں رحمان کے

نیوی میں بطور سیلر میڈیکل کے شعبے میں بھرتی ہونے والے اورنگ زیب (۲ فروری ۱۹۵۲ء۔ ۱۲ فروری ۲۰۱۰ء) جسے لوگ عدیم یوسفی کے نام سے جانتے ہیں ایف ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں فوج کا حصہ بنے۔ دورانِ ملازمت ایل ایس ایم ایف کا کورس مکمل کیا اور ملازمت کے بعد اپنا کلینک بنالیا۔ ادب میں آپ تصوف کی طرف مائل تھے۔ نثر میں "مقصدِ تخلیقِ کائنات اور انسان" آپ کی بامقصد کتاب ہے۔ "مشک بار" کے نام سے آپ کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ وفات سے قبل آپ کا مسودہ "حقیقتِ روحانیت" پریس میں جا چکا تھا۔ راقم کی نظر سے یہ مسودہ گزر چکا تھا۔ اگر یہ کتاب چھپ جاتی تو تصوف کے موضوع پر ایک عمدہ اضافہ ہوتا۔

ایک شاعر، سفر نامہ نگار، منظوم سیرت نگار، ادیب، مرتب اور مؤلف سوار سبحان الدین (۳۰ مئی ۱۹۵۲ء) جو اردو ادب میں حاجی گل بخشالوی کے نام سے اپنی پہچان اردو دنیا میں بنا چکے ہیں، میٹرک کے بعد فوج کے شعبہ آرمڈ کور میں سوار (سپاہی) کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ آپ نے کچھ عرصہ فوج میں گزارا اور پھر خیر باد کہہ کر اپنا کاروبار کرنے لگے۔ بالآخر ملک سے باہر چلے گئے اور ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد واپس لوٹے۔ آپ کی تقریباً بتیس تصانیف، تالیفات اور مدون کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں آپ کے نعتیہ مجموعے "منظوم سیرت النبی ﷺ"، "گلزارِ محمد ﷺ" اور "گلستانِ نعت" بھی شامل ہیں۔ ترتیب دیئے ہوئے نعتیہ مجموعے ان سے الگ ہیں۔ ؎

بخت بیدار ہیں وہ جن کو خدا لے جائے : ہم کو بھی کاش مدینہ میں قضا لے جائے

جامِ کوثر کے لئے وہ نہ پریشاں ہو گا : دل میں جو اپنے محمد ﷺ کو بسا لے جائے

آرمی ایجوکیشن کور میں خدمات انجام دینے والے لیفٹیننٹ کرنل شاہد کوثری (۵ مارچ ۱۹۵۴ء) فیصل آباد میں پیدا ہوئے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد میں سکونت اختیار کی۔ انگریزی اور اردو میں آپ لکھتے ہیں۔ انگریزی اور اردو میں ۱×۱ انثری تصنیف کے علاوہ آپ کا نعتیہ مجموعہ "ہالۂ رحمت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

میجر محمد اسلم سیالوی (یکم جنوری ۱۹۵۸ء) کی جنم بھومی مشائخ کی بستی سیال شریف ضلع سرگودھا ہے۔ آپ فاضل دارالعلوم سیال شریف، بعدہٗ عربی اور ایجوکیشن میں ایم اے کیا اور ایجوکیشن کور میں کمیشن حاصل کیا۔ ملازمت کے دوران جہاں سعودی عرب میں خدمات انجام دیں وہیں امیریکن یونیورسٹی قاہرہ (مصر) سے ایڈوانس عربیک کورس بھی کیا۔ پنشن یاب ہونے کے لاہور میں اقامت اختیار کی۔ "اوجِ سعادت" کے نام سے آپ کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

آرمی میڈیکل کور میں خدمات ادا کرنے ولے حوالدار محمد سلیم محرم (۱۹ فروری ۱۹۵۷ء) میٹرک اور ڈسپنسری کورس کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوگئے۔ تعلیمی سلسلے کو بھی جاری رکھا اور ایف اے کیا اور سبکدوشی کے بعد سوئی گیس سٹیشن ہیڈ کوارٹر ڈسپنسری فیصل آباد میں ملازمت اختیار کرلی۔ تعلیمی قابلیت کو مزید آگے بڑھایا اور درسِ نظامی، فاضل نظامی، بی اے اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "چشمِ آہو" کے نام سے اور ایک نعتیہ مجموعہ "ثنائے سرورِ عالم ﷺ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

شیخ الحدیث، عالمِ دین چیف ٹیک پیر غلام رسول قاسمی قادری نقشبندی (۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء) میٹرک کے بعد ایئر فورس میں بھرتی ہوئے۔ دوران ملازمت گریجوایشن کیا۔ اسی دوران پیر سید فیروز شاہ قاسمی سے روحانی فیض پایا اور دین کی تبلیغ کی طرف مائل ہوئے۔ آپ نے عربی، فارسی، انگریزی، پنجابی، سندھی، پشتو اور اردو زبانوں پر اپنی گرفت مضبوط کی اور ان تمام زبانوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان تمام زبانوں میں آپ کی تیس کے لگ بھگ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کا نعتیہ مجموعہ "خیر الکلام فی مدح سید الانام" شائع ہو چکا ہے جس میں مذکورہ تمام زبانوں میں نعت موجود ہے۔

جس کی سرکار کے کوچے سے شناسائی ہے : اُس نے فردوس میں واللہ جگہ پائی ہے
کب سے ویرانۂ مغرب میں بھٹکنے والو : اُن کے دربار چلے آؤ، بہار آئی ہے

کیپٹن غنی عاصم نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد فوج میں شمولیت اختیار کی۔ میڈیکل کور میں ڈاکٹر کی حیثیت سے چند سال کی خدمات کی انجام دہی کے بعد رخصت لے لی۔ کچھ عرصہ صحرائے عرب میں گزارا اور پھر ڈیرہ غازی خان میں اپنے لوگوں کی خدمت کرنے لگے۔ آپ کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے "نکہتِ بادِ بہاری" نعتیہ مجموعۂ کلام ہے۔

سراپا محبت و محنت چھب تحصیل جنڈ کے ساغری قبیلہ کے فرد چیف ٹیک شوکت محمود شوکت (۲ نومبر ۱۹۶۷ء) نے ایئر فورس میں ملازمت کے دوران ایم اے، ایم فل، ایل ایل بی، شریعۃ لاء، اور بی ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ میڈیکل بورڈ کے بعد کچھ عرصہ وکالت کی اور پھر تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ آج کل گورنمنٹ کالج پنڈی گھیب میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے چار شعری مجموعے اور دو مرتبہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ایک حمدیہ اور "معراجِ سخن" نعتیہ مجموعہ ہے۔

پڑھوں درود تو آرامِ جاں میسر ہو : غموں کی دھوپ میں اک سائباں میسر ہو
عطا ہوں کوثر و تسنیم سے دھلے الفاظ : کہوں جو نعت، معطر زباں میسر ہو

حوالدار محمد یعقوب فردوسی (یکم فروری ۱۹۶۸ء) ایف ایس سی نامکمل چھوڑ کر پہلے ریلوے اور پھر فوج میں ایک لمبا عرصہ گزار کر پنشن یاب ہوئے۔ اردو اور پنجابی زبانوں میں شعر، کہانی، افسانہ، ناول اور کالم لکھا لیکن اردو ماہیا میں نام کمایا اور ریکارڈ بنائے۔ دو

درجن کے لگ بھگ آپ کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ "مدینہ مدینہ پیارا مدینہ" آپ کا پہلا نعتیہ مجموعہ تھا اور یہ بھی ماہیا کی ہیئت میں تھا۔ فردوسی کے دوماہیے دیکھیے: ؎

یوں دل کو لبھاتا ہوں : آپ کے روضے کی : تصویر بناتا ہوں
اک وجد میں رہتا ہوں : شاہِ مدینہ ﷺ کے : جب ماہیے کہتا ہوں

فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے نائیک امیر قلم خان (۱۰/ اکتوبر ۱۹۶۸ء) جو ادبی دنیا میں راحت امیر نیازی کے نام سے پہچانے گئے کے ذوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پانچ جماعت تک تعلیم حاصل کی اور آج کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات پر ایم فل کا ایک مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ کئی رسالوں کی ادارت، ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ اور ایک پبلشنگ ادارہ کا انتظام آپ کی مصروفیات ہیں۔ آپ کا نعتیہ مجموعہ "ترا دستِ شفا چاہوں" شائع ہو چکا ہے۔

مردان کے ایک چھوٹے سے گاؤں پئی خیل کے باسی نائیک شاہ روم ولی (۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء) اردو ادب میں بہت کم عرصے میں اپنا مقام بنانے میں اتنے کامیاب ہوئے کہ اردو دنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ایف اے کرنے کے بعد فوج میں شمولیت اختیار کی۔ مردان سے ایک رسالہ "املاک" کے نام سے نکال رہے ہیں اور "وجود کا سورج"، "دکھ مسافر ہیں"، "چراغ" اور "گفتن" کے بعد حال ہی میں آپ کا نعتیہ مجموعہ "آفرینش" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کی انفرادیت شاعری میں پہلا مکالماتی نعتیہ مجموعہ ہونا ہے۔ نمونہ کلام حاضر ہے: ؎

اس نے کہا کہ تیرگی مٹنے کا حل بتا : میں نے کہا کہ نور ہمارے رسول ﷺ ہیں
اُس نے کہا کہ دورِ جہالت تمام شد : میں نے کہا شعور ہمارے رسول ﷺ ہیں

آخر میں اپنے دو نعتیہ اشعار کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ ؎

تھا راعنا پہ صورتِ انظر بدل دیا : ابہام کا ہر ایک تصور بدل دیا
نعتِ نبی نے معنیٔ ترتیل کھول کر : ہر ساز ختم کر دیا ہر سُر بدل دیا

حوالہ جات

۱۔ جامع ترمذی، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابواب المناقب، حدیث نمبر ۱۵۷۲

۲۔ دیکھیے راقم کی کتاب ''مقالاتِ نو''مطبوعہ رنگِ ادب کراچی،۲۰۱۷ء، نیز چوہدری عبدالغفور نے اپنے مضمون ''امیر خسرو اور حسن سنجری کی عسکری خدمات۔ دونوں کی زندگیوں کا موازنہ''مطبوعہ مجلہ تاریخ وثقافت پاکستان، جولائی تا دسمبر۔۲۰۱۷ء

۳۔ اس پوری بحث میں صرف اُن شعراء کا ذکر مقصود ہے جن کے نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ناول رقص نامہ میں سندھی عناصر اور سندھی سماج

کومل شہزادی، پی ایچ ڈی اسکالر

سندھ کی سرزمین دنیا کی واحد دھرتی ہے جہاں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کے قدم پڑے اور ان کی اولاد کا جنم و دفن ہوا، ھابیل بن آدم داد و ضلع کے کاچھو کے علاقے کا سبو جبل (پہاڑ) میں مدفون ہے حضرت محمد ﷺ کو بھی سندھ کی سرزمین سے بیحد پیار و محبت تھی جن کے حوالہ جات آگے آئیں گے۔ قرآن پاک میں سندھی قوم کا ذکر ہوا ہے، کتنے ہی سائنس اور تاریخی حوالہ جات ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سندھ ہی انسانی و حیوانی ارتقا کا جنم بھومی ہے۔ جب تمام دنیا کی دھرتی برف کے تہوں سے برف پوش تھی تب سندھ کی دھرتی ہی وہ واحد خطہ ارض تھا جہاں برف نہیں ہوتی تھی اور گرم رہنے والا خطہ تھا، جہاں انسان اور حیوان موجود تھے، شونکہ سردی میں انسان اور جاندار کا زندہ رہنا ممکن ہی نہیں ہوتا اور گرم علاقہ صرف سندھ کی سرزمین ہے سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ سندھ کی تاریخ عربوں کھربوں برس پرانی ہے، سندھ کا خطہ تاریخ کے ان خطوں میں شمار کیا جاتا ہے جہاں مسلسل آبادی و خوشحالی رہی ہے۔ سندھ کی سرزمین پر موہن جو دڑو، ہڑپہ کی عظیم تہذیبوں نے جنم لیا جن کا مرکز موہن دڑو رہا ہے، موہن جو دڑو کی نسبت سے علما سے ملاقاتوں میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ عاد قبیلے کا جد امجد موھن نامی ایک شخص تھا، جنہوں نے رنی کوٹ کا قلعہ تعمیر کروایا۔ سرزمین سندھ کو اپنے مورث اعلیٰ حضرت سندھ سے منسوب سات دریاؤں سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ سات دریا ہمالیہ کے پہاڑوں کے برف پوش ٹیلوں کی چوٹیوں سے چھوٹے چھوٹے چشموں کی صورت میں بہتے ہیں۔ سندھ کی تاریخ نامعلوم دور سے زمین دو تہوں میں چھپائی گئی ہے۔ یہ انسان کی پیدائش کا مرکز ہے بلکہ ایسا کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ ارتقا کا گھر ہے۔ سندھ کی سرزمین، قدامت اور تہذیبی اولیت اس سائنسی و کمپیوٹرائز دور میں تمام دنیا میں مقبول ہو چکی ہے۔ اسی ضمن میں امریکا کی خاتون محققہ او میل کی تحقیقی کتاب جس کا سندھی میں ترجمہ سندھو تہذیب سندھو دھرم جا یورپ میں قدیم آثار کے عنوان سے عطا محمد بھنبرو نے کیا ہے جس میں انہوں نے سندھ کی تہذیب کو دنیا کی تہذیبوں مثلاً مصر، میسوپوٹیما، عراق، دجلا فرات کی تہذیبوں سے بالاتر کہاں ہے۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یہ تمام مذکورہ تہذیبیں سندھو تہذیب کا مقابلہ کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتیں۔ لیکن سردار سندھی نامی ایک مصنف اپنی محدود سوچ اور کم علمی کے باعث ابھی تک دجلا فرات کی تہذیب میں پھنسا ہوا ہے کہ دجلا فرات میں پرانے گاؤں ملے ہیں اور زراعت بھی وہاں شروع ہوئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں سندھ کے معاشرے اور تمدن کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے تہذیبی حالات پر نظر ڈالی جائے۔ سندھ اس برصغیر میں اسلامی تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز رہا ہے۔ برصغیر میں سند میں ہی وہ ملک ہے۔ جہاں سب سے پہلے اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ سندھ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کو باب الاسلام کہا

جاتا ہے۔ حجاز سے جو اسلامی علم و عمل کی موجیں اٹھیں وہ دریائے سندھ سے ٹکرائیں اور اس برصغیر کو اسلام کے نور سے منور کر دیا ۔سندھ میں حجاز سے اسلامی علوم اور روحانی قافلوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور سندھ کی اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا دیا۔ عربوں کی سادہ زندگی نے سندھ کے تمدن اسلام کے وہ تحائف ہیں جو عربوں کے آنے کے بعد سندھ میں عام ہوئے۔ برطانوی عہد سے پہلے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں خلوص و محبت ،اتحاد و یگانگت اور مذہبی رواداری تھی۔ لیکن انگریزوں کے عہد میں یہ رواداریاں ختم ہوئیں اور برصغیر کے ہر خطے پر جہاں بھی انگریز نے اقتدار حاصل کیا پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو پر عمل کیا۔ سندھ کی معاشرتی زندگی میں کوئی توازن نہ تھا۔ سندھ کی سماجی حالت اس درجہ تباہ تھی کہ زندگی کی ساری لذتیں اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ سندھ کے غریب طبقے جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ضرورت کے بغیر سندھ کے دیہی لوگ حرکت نہیں کرتے۔ یہ لوگ سارا دن بیٹھے رہتے ہیں اور ساری رات تمباکو نوشی اور باتوں میں گزار دیتے ہیں۔ تقریبا تمام لوگ ہی کسی نہ کسی نشے کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ بھنگ چونکہ سب سے زیادہ سستی ہے اس لئے وہ عام ہے۔ سندھی گانوں کے بہت شوقین ہیں ان کے ہاں اچھے ساز بھی ہیں اور اچھے گویے بھی ہیں۔ اردو ناول میں دیہی ماحول اور معاشرت کی عکاسی میں عبداللہ حسین ،شوکت صدیقی،ابوالفضل صدیقی اور مستنصر حسین تاڑر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہیں جیم عباسی بھی شامل ہیں۔ دیہات اور شہر کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم پاکستان کے دیہی اور بلدیاتی آبادی کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی کل آبادی کا ستر فیصد سے زیادہ حصہ دیہات میں سکونت پذیر ہے اس بات کی وضاحت جاننے کے لیے کسی خطے کی اصل تہذیب و معاشرے کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں دیہات کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کسی بھی خطے کی تہذیب و معاشرت کی حقیقی بنیادوں کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں شہر چھوڑ کر دیہات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ آج کل سندھ ،پاکستان کا ایک جزو ہے ،سندھ کا نام سن کر جو تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ اسی چھوٹے سے ملک کا تصور ہوتا ہے۔ سندھ کی دیہی معاشرے پر اب بات کریں تو سندھ کی معاشرتی زندگی میں کوئی توازن نہ تھا۔ سندھ کی سماجی حالت اس درجہ تباہ تھی کہ زندگی کی ساری لذتیں اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے مخصوص تھیں۔ سندھ کے غریب طبقے جانوروں جیسی زندگیبسر کرنے پر مجبور تھے۔ ضرورت کے بغیر سندھ کے دیہی لوگ حرکت نہیں کرتے۔ ناول میں سندھ کی جو صورت گری ہوئی ہے وہ دراصل انسانی مسائل اور آشوب حیات ہی کے حوالے سے ہوئی ہے۔ ان کا پہلا ناول "رقص نامہ" 2021ء میں شائع ہوا۔ جس کا لوکیل سندھ کی دیہی معاشرت ہے۔ یہ ایک منفرد ناول ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تین سو پینتیس صفحات پر مشتمل یہ ناول سٹی پریس بک کراچی نے شائع کیا ہے۔ ناول "رقص نامہ "جس میں ہمیں سندھ کے دیہی کلچر کی عکاسی ملتی ہے۔ "اس ناول کے ذریعے سندھ کی دیہی معاشرت کی اردو فکشن میں کامیاب مقام حاصل ہے۔"ا

دیہی زندگی میں پنچائیت ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ پنچ جو فیصلہ کر دیتے ہیں وہ حتمی ہوتا ہے۔ اسی طرح جیم عباسی نے "رقص نامہ "میں سندھ کی دیہی معاشرت پائے جانے والے اس پہلو کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ ناول میں پیر سید عبدالرحمن یہ کردار ادا کرتا ہے۔ کہ پورے دیہات میں اس کے اجازت نامے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کسی کا معمولی سا معاملہ بھی ہو وہ پیر صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ دیہی مسائل سے لے کر کسی کے بچے کے سکول جانے تک تمام کاموں کو کرنے کے لیے اول اجازت نامہ پیر صاحب سے لیناضروری ہوتا ہے۔ ایسا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی کام کر لیا جائے۔ دیہی معاشرت میں یہ پنچائیت سسٹم جسے ہم جرگہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ناول "رقص نامہ "میں مذہبی عقائد ،مذہبی انتہاپسندی اور مذہبی جبر کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جس سے سندھی دیہی معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انگریزی علاج اور انگریزی پڑھائی دونوں گاؤں میں ممنوع تھی۔ سائیں عبدالرحمن شاہ کی باتوں پر سب دیہی طبقہ لبیک کہتا تھا اور ان سب کا ماننا تھا کہ اپنے مرشد کی بات ماننے والا اور اُس کے بتائے راستے پر چلنے والے کا ادھر بھی بیڑا پار اور آگے بھی۔ اس لیے مرشد کا دامن پکڑ کر چلو۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی علاج کو اس معیوب سمجھا جاتا تھا کہ یہ سب کرنے والا بے دین ہو جاتا ہے۔

"یہ سب دین میں خلل پیدا کرنے کے لیے شیطانی حربے ہیں۔ ان سے دور رہو۔ خود کو بھی بچاؤ، اپنی اولاد کو بھی بچاؤ" ۲

مذہبی جبر اور گوٹھ کے دیہات پر مذہبی شدت پسندی عروج پر تھی۔ اور یہ سب نظام سائیں کا رائج کیا ہوا تھا۔ سلیمان شاہ ایک دفعہ دوستوں ساتھ نہر پر چلا جاتا ہے۔ جس پر سائیں سخت غصہ کرتے ہیں کہ ایسے بچے آوارہ ہو جائیں گے اور دین سے دور ہو جائیں گے ۔اتنے چھوٹے نہر پر جانے کی ہمت کر گئے۔ پھر انہیں ہوٹل پر جانے سے کون روکے گا۔ یہ ہی بازاروں میں کل کو آوارہ گردی کریں گے۔ سائیں اس کو سخت سزا دینا چاہتا ہے کیونکہ یہ سائیں کی اولاد ہے تو اس کے ایمان کا ذمے دار بھی سربراہ ہے۔ سائیں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ آج نہ سدھرے گا تو کل کو اس کی بداعمالیاں مجھے جہنم تک جا پہنچائیں گی۔ سلیمان شاہ اور عبداللہ کو نظام کی خلاف ورزی کرنے پر دونوں کو سو مرتبہ اٹھک بیٹھک کی سزا دی جاتی ہے۔ پورے گوٹھ پر مذہبی جبر کا نظام لاگو تھا۔ جس کی خلاف ورزی پر سزا تک دی جاتی تھی تاکہ کوئی بے دینی کی جانب نہ نکل جائے۔ سندھ کی دیہی معاشرت میں پیر و مریدی کا نظام عروج پر تھا جس کو ناول نگار جیم عباسی نے بہت عمدہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ دیہی طبقے کا اس کی جانب رجحان اور پیر کے ہر حکم پر لبیک کہنا ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھا۔

ناول میں ایک جگہ جیم عباسی نے اندرون سندھ کی مختصر تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کہ سندھ کا ایک بڑا علاقہ ڈاکو راج میں جی رہا تھا ۔پولیس بے بس بن چکی تھی اور فوجی حکومت ہونے کے باوجود کچھ بھی کرنے سے قاصی تھی۔ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت معورچے بنائے ساری ساری رات جاگتے رہتے۔ اخباریں اغوا کی خبروں سے بھری ملتیں۔ حالات یہ تھے کہ غریب و امیر کا فرق

مٹ گیا تھا۔ جو ملتا اغوا ہو جاتا۔ یہ سندھ کے کچھ علاقے کی صورت حال کا تذکرہ سندھ کی تاریخ پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ "حاجی غلام مصطفیٰ اسی صورتحال کے باعث پانچ عدد ہتھیاڑوں کے لائسنس بنوالایا تھا۔"[۳] اسی طرح ناول کے دوسرے حصے میں بھی سندھ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے سندھ کا احوال بہترین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو سندھ کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ مے خانے میں بیٹھ کر سائیں صوفی، رام داس اور سب بیٹھ کر اس پر تفصیلی روشنی ڈال رہے تھے کہ سندھ والوں کا شیراز جیسا نصیب نہ تھا۔ رام داس یہ سب بیان کرتے ہوئے دکھی تھا۔ غلام شاہ کلہوڑو پر کیا گیا ظلم اور دوسری جنگ کے وقت غلام شاہ کلہوڑا نے سندھو دریا کی دوسری شاخ جو کچھ کے علاقے سے گزر کر سمندر میں گرتی تھی، اس کو اپنی حد اندر بڑا پشتہ بنوا کر کچھ والی شاخ کا پورا بہاؤ روک دیا۔ سندھ کی مختصر تاریخ سے سندھ میں آنے والی حکومتوں کا مختصر احوال ناول نگار جیم عباسی نے جس انداز سے کرداروں کی زبانی بیان کروایا ہے وہ قابل داد ہے۔

دیہات میں پیر کی وفات کے بعد اس کا بڑا صاحبزادہ گدی نشین ہو کر دیہی افراد کے لیے اُسی طرح پیر و مرشدی کا کردار ادا کرتا ہے جیسے اس سے پہلے سائیں کرتے ہیں۔ جدھر مریدین کے لیے سائیں عبدالرحمٰن شاہ کی وفات آفت تھی۔ سندھ کے دیہی علاقے گوٹھ میں ایسے معاملات بلکہ دیہی معاشرت میں ہر جگہ ایسا ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ناول نگار نے اس پہلو کی عکاسی عمدہ انداز میں کی ہے۔ سندھ کی دیہی معاشرت کے ساتھ ویسے ہی کردار سندھی دیہی معاشرے کی عکاسی کرتے دکھائے گئے ہیں۔

ناول کے دوسرے حصے میں سندھ کی دیہی معاشرت کی عکاسی کچھ اس انداز میں کی گئی ہے جو ناول کے پہلے حصے سے بہت مختلف ہے۔ جس میں مے خانے میں دوغلا ماحول جس میں مے اور کنجریوں کو ناچتے ہوئے وغیرہ شامل ہے جو ایک طرف فقیر کا کردار ہے دوسری جانب ان کاموں کی طرف مائل ہے۔ بیک وقت دو ماحول دوگلے پن کا ظاہر کرتا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے میں بھی پیر و فقیری کو دکھایا گیا ہے لیکن پہلے اور اس حصے کی پیری میں بیت امتیاز پایا جاتا ہے۔ دیہی طبقے میں پیر کو اعلیٰ درجے پر رکھا جاتا ہے کیونکہ دم و تعویزات کا کام بھی پیر سے لیا جاتا ہے۔ مے خانے میں صوفی حیدر بخش کے پاس وہی لوگ شوق سے آتے تھے۔ صوفی کے پاس کبھی کوئی دعا یا ترکیب کے لیے آجاتا جن کی مدد کے لیے صوفی ہر وقت تیار رہتا۔ ناول نگار جیم عباسی نے صوفی کی پیری کو کچھ یوں دکھایا ہے۔

"دعا تعویز سے لے کر سرکاری آفیسوں کے کام، تھانے
اور اسپتال تک کے کام شامل تھے۔"[۴]

پورے ناول میں سندھ کا دیہی لب و لہجہ، سندھی دیہی کلچر، دیہی منظر نامہ، سندھی زبان میں کہلوائے گئے کرداروں سے مکالمے سب سندھ کے دیہی معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں فصل تیار ہو تو سب گاؤں میں خوشی کی لہر آجاتی ہے

۔ان کی محنت کی وصولی ان کو ملنے کے قریب ہوتی ہے۔ دیہی علاقوں میں ابھی بھی گھوڑا سواری اور ٹانگے کی سواری عام ہے۔ یہ ہی دیہی معاشرے کی روایات ہیں جو ابھی بھی باقی ہیں۔ ناول "رقص نامہ" میں بھی مصنف نے دکھایا ہے کہ سندھ کے دیہی علاقوں میں سواری کے لیے ابھی بھی ٹانگے کی سواری ہے۔ سائیں جب لانگری فقیر کے ساتھ سفر کرتے ہیں تو وہ ٹانگے کی سواری کا انتخاب کرتے ہیں۔ "تانگے کی پٹھلی سیٹ پر بیٹھے تسبیح کے دانے پھیرتے ان کے چہرے پر چمک تھی۔ اگلی سیٹ پر کچبان کے ساتھ بیٹھا لانگری نسخہ خاص اور معجون والے مرتبان گود میں سنبھالے ہوئے تھا۔"۵ سندھ کی دیہی معاشرت پر لکھا جانے والا ایک اہم ناول ہے۔ ناول میں کرداروں کے مکالمے سے سندھی لب ولہجہ ظاہر ہوتا ہے محض لفظ ہی نہیں کرداروں کے کیے گئے مکالمے میں جملہ سازی میں بھی دیہی سندھ کے بھرپور اثرات ملتے ہیں۔ ناول "رقص نامہ" میں جیم عباسی نے وہی مکالمے استعمال کیے ہیں جو سندھ کے دیہی افراد کی زبان تھی۔ اسی طبقے کے لوگوں سے وہی مکالمے ادا کروائے جو سندھ کے دیہی معاشرت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں مصنف نے مکالمے جیسے تحریر کیے ہیں ان میں سے کچھ ملاحظہ کیجیے:

"سائیں، ایک ہندو تھا بالچند۔ اسے کسی مسلمان نے وانڑیو
کہا۔ وانڑیو لفظ ہندو کو خواری کے لیے بولتے تھے۔ تحقیرا
وانڑیو کہتے تھے۔"۶

علاوہ ازیں سندھی شاعری میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کے اشعار بھی ناول کے دوسرے حصے میں تحریر کیے ہیں۔ سندھی زبان میں شاعری کرنے والوں میں ان کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ سندھی ایک قدیم زبان ہے۔ یہ ہی وجہ کہ سندھی ادب بھی قدیم ہے۔ سندھی لوک ادب کے علاوہ سندھی زبان میں شاعری اور نثر کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ سندھی زبان سے واقفیت رکھنے والے تو ان شعرا شاہ لطیف اور سچل سرمست کی شاعری سے بخوبی واقف ہوں گے۔ سندھ کے دیہی افراد سے ویسے مکالمے جو اُن کے دیہی زبان کو نمایاں کرتے ہیں۔ ناول نگار نے ویسے ہی الفاظ چنے ہیں، جو کرداروں پر خوب بھاتے ہیں۔ کرداروں کے لب ولہجہ سے بھی سندھ کی دیہی معاشرت دیکھی جاسکتی ہے۔

المختصر، جیم عباسی نے سندھ کے دیہی لوگوں کے رہن سہن، سماجی رویوں، دیہی کلچر اور سندھ کی تاریخ وثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں جیم عباسی نے سندھ کے خدوخال کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ مزید برآں سندھ کے دیہی لوگوں کی طرز زندگی اور طرز احساس، مذہبی جبر، مذہبی شدت پسندی، مذہبی عقائد، توہم پرستی پر عمدہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ "رقص نامہ" میں مذہبی عقائد، مذہبی انتہا پسندی اور مذہبی جبر کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جس سے سندھی دیہی معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے ۔ کس طرح دیہی علاقوں میں مذہبی صورت حال ہے ناول میں اس کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

سائیں عبدالرحمن شاہ نے گاؤں میں ایک قانون بنایا ہوتا ہے کہ نماز نہ پڑھنے والے کو سزا اور جرمانہ ہو گا۔ اگر کوئی کسی نماز پر نہ پہنچتا تو جرمانہ ادا کرنا اُس پر عائد ہوتا۔ دینی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ جس نے گاؤں میں رہ1 کر اس نظام کی خلاف ورزی کی۔ اُس پر سزا نافذ ہوتی تھی۔ مذہبی جبر اور گوٹھ کے دیہات پر مذہبی شدت پسندی عروج پر تھی۔ اور یہ سب نظام سائیں کا رائج کیا ہوا تھا ۔سندھ کی دیہی معاشرت میں پیر و مریدی کا نظام عروج پر تھا جس کو ناول نگار جیم عباسی نے بہت عمدہ انداز میں تحریر کیا ہے۔

حواشی

۱۔ جیم عباسی، رقص نامہ، کراچی: سٹی پریس، 2016ء، ص40

۲۔ ایضا، ص22

۳۔ ایضا، ص232

۴۔ ایضا، ص280

۵۔ ایضا، ص319

۶۔ ایضا، ص228

اردو شاعری میں قدرتی مظاہر کی تصویر کشی

ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ

اردو شاعری کا ایک اہم پہلو قدرتی مظاہر و مناظر کی تصویر کشی ہے۔ ایک طرف شاعر کی اندرونی کیفیت ہوتی ہے اور دوسری طرف وسیع و عریض کائنات اور اس کے بکھرے ہوئے حسین قدرتی مظاہر کا منظر ہوتا ہے۔ اردو ادب کے بہت سارے مشاہیر نے فطرت نگاری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ہاں فطرت کے حسن کا ذکر ملتا ہے۔ جن قدرتی اشیاء کا تذکرہ کرتے ہیں ان میں اپنی دلی کیفیات کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ فطرت نگاری میں شاعر اپنی دلی کیفیات و محسوسات کو قدرتی نظاروں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ عصر حاضر میں پیسے کی دوڑ اور صنعتی انقلاب نے کائنات کے حسین مناظر کو شدید خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔

زمین پر بڑھتی ہوئی آلودگی کا انسان، جانداروں اور ماحول پر نقصان دہ اثر پڑ رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ قدرتی عناصر کا غیر دانشمندانہ استعمال ہے۔ اس لیے قدرتی وسائل میں انسان کی مداخلت کو کم کرنا اور روک تھام کے لئے کردار ادا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ زمین کی آلودگی نہ صرف انسانوں کی صحت کے لئے خطرناک ہے بلکہ موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ فکر کا حامل انسان معاشی خوشحالی کے چکر میں نسل انسانی کے ساتھ ساتھ کرہ ارض پر پائی جانے والی دیگر مخلوقات کو بھی بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ بہت سارے مشاہیر نے اپنی شاعری میں قدرتی عناصر کے استحصال اور ماحولیاتی آلودگی کی مذمت کی ہے۔ اردو ادب کے مشاہیر کا اس قومی و انسانی خدمت اور قدرتی مظاہر سے محبت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

ظفر اقبال ظفر قدرتی مظاہر کی تباہی میں انسان کے کردار کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جنگلی حیات ہوتی ہے معدوم ،ہو تو ہو
میرا شکار شوق ہے،ماروں گا بے حساب
بھر یار، دوستوں گا فخر سے
اور ان کو بھی کھلاؤں گا میں تکے اور کباب
نائب خدا کا ہوں ،مر ی مرضی جو کروں!
دریا اگر ہیں خشک تو ،مجھ کو غرض نہیں
پانی ہے میرے گھر میں، میں ٹب میں نہاؤں گا
میں شیو جب بناؤں گا تو نل کروں کیوں بند!
نائب خدا کا ہوں،مری مرضی میں جو کروں!

لوگ ہیں بقراط! جو یہ کہتے ہیں مجھ سے
اوزون کی چادر ہوئی چھلنی ،سو وہ میں ہوں
صنعت کی ترقی کا ہے باعث یہ حرارت
موسم میں بپا ہے جو تغیر ، سو وہ میں ہوں
نائب خدا کا ہوں ،مری مرضی میں جو کروں!
اپنے ہی کئے کی میں سزا کا ٹ رہا ہوں
خود اپنے ہی زخموں کو پڑا چاٹ رہا ہوں
نادان ہوں،کم فہم ہوں،پاگل ہوں ،کیا ہوں!؟
جس شاخ پہ بیٹھا ہوں ،وہی کاٹ رہا ہوں

سلیم واحد سلیم اپنی شاعری میں انتہائی دل نشین انداز میں کائنات کی وسعتوں اور قدرتی حسن کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ دنیا کی تمام رنگینی اور رونق انسان ہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ مخلوقاتِ خدا میں انسان کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ وہ قدرت کی تمام قوتوں کو تسخیر کر سکتا ہے۔ دنیا میں انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور کائنات کے تحفظ کی ذمہ داری بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

یہ کائنات کی رنگینیاں ہیں تیرے لیے
کہ آدمی کے لیے ہے جہان بو قلموں
فلک بھی عظمت انساں کے گیت گاتا ہے
یہ مت کہو کہ ستاروں پہ دسترس ہی نہیں

سعیدہ صبا سیالکوٹی کی شاعری کی ایک اہم خوبی فطرت نگاری ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت اور مناظر فطرت کی تصویر کشی دیکھی جا سکتی ہے۔ اپنی ایک نظم "مری کے مناظر قدرت" میں صبا ملکہ کوہسار کے قدرتی دلکش مناظر کا خوبصورت انداز میں نقشہ کھینچتی ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھے گلستاں کی بہاروں میں دیکھا
مہکتے ہوئے سبزہ زاروں میں دیکھا
کہیں جھیل ڈل کے کناروں میں دیکھا
ترا روپ میں نے ستاروں میں دیکھا
ستائش میں ساری فضا دیکھتی ہوں
میں اک سمت شانِ خدا دیکھتی ہوں
رواں ہیں کہیں آبشاروں میں پانی
کرے رقص جیسے کسی کی جوانی
کہ جیسے یہاں ہو رہی نغمہ خوانی
کہیں حور وش مدلقا کی زبانی

مجید امجد اپنی شاعری میں اپنے احساسات کے اظہار کے لئے قدرتی مظاہر کا سہارا لیتے ہیں۔ان کی نظموں میں کھیتوں،درختوں،سبزہ،پھول اور رنگوں کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ان کی فطرت پرستی میں ایک اہم عنصر یہ ہے کہ وہ اپنے دیس کے دریاؤں، چناروں، کہساروں،کھیتوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں،اس لئے راہ چلتے قدرتی مناظر اس کی سوچ کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ مظاہر فطرت کی طرف رغبت سے مجید امجد کا احساسِ جمال نکھر کر سامنے آتا ہے۔ سرسبز کھیتوں میں مست ہواؤں کی موج پر لہکتی ہوئی حسین محبوبہ کا تصور اور اس کی نگاہوں سے نگاہوں کا چار ہونا دل کی احساس و کیفیت کو اور پُر کیف بنا دیتا ہے۔ مظاہر فطرت سے ان کی محبت جذباتی ہے۔فطرت کے نظام میں انسان کے ہاتھوں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس پر مجید امجد کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم

قاتل تیشے چیر گئے اُن ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اِک میری سوچ، لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

مولانا ظفر علی خاں مناظر قدرت اور فطری جذبات کی عکاسی کرنے میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ وہ ہر واقعہ یا قدرتی منظر کی پوری تصویر الفاظ میں کھینچ دیتے ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آئی ہے دبے پاؤں صبا اس کو جگانے
انگڑائیاں لیتے ہوئے سبزے کی ادا دیکھ
سورج کا پتا پوچھتی پھرتی ہے خدائی
بادل کو اس انداز سے گردوں پہ گھرا دیکھ

علامہ اقبال کی کی بہت سی نظموں میں قدرت حسین مناظر کی دلکش تصویر کشی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ان کی متعدد نظمیں فطرت سے ان کے لگاؤ اور دل بستگی کی غماز ہیں۔ علامہ اقبال فطرت کو انسان کے مدِ مقابل سمجھتے ہوئے اسے مسخر کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ کائنات کے رازوں کو جاننے کے متمنی ہیں۔ تسخیر فطرت کے حوالے سے ان کی نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردہ میں چھپا دیکھ!

ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ!
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!
نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!

مرزا محمد رفیع سودا کے اشعار میں سائنسی شعور

سجاد نقوی، سیالکوٹ

اردو شاعری کی سرفرازی، دل کشش رنگا رنگی اور پر کشش خیال بندی میں اٹھارویں صدی کے شعرا کا کردار نا قابل فراموش ہے۔اس دور کے شعرا کرام نے اردو نظم کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کر کے اردو شاعری کو زینت بخشی اور زبان و بیان کو پختگی کے زیور سے آراستہ کیا۔اسی دور کے ایک عظیم الشان، قادر الکلام اور ملک الشعرا، استاد مرزا محمد رفیع سودا کا اسم گرامی شعری افق پر اظہر من الشمس ہے۔اردو شاعری کی کلاسیکل روایت ذکر سودا کے بغیر ادھوری اور بے ذائقہ ہے۔میر تقی میر اور خواجہ درد آپ کے معاصرین میں شامل ہیں۔لیکن ان دونوں شاعروں میں مرزا سودا اپنا ایک الگ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔کچھ ناقدین میر اور سودا کے کلام کے درمیان مقابلے کی زد میں میر کو سودا پر ترجیح دے کر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔جبکہ سودا تمام شعرا سے ہٹ کر اپنے شعری میدان میں پرکھے جائیں تو نہ صرف شعریات پر پورا اترتے دکھائی دیتے ہیں بل کہ وہ اردو کلاسیکل روایت کے مایہ ناز شاعر گردانے جاتے ہیں۔

مرزا رفیع سودا، خان آرزو کے صحبت نشین تھے اور ان کے مشورے پر فارسی سے اردو شاعری کی جانب راغب ہوئے اور یکتائے زمانہ کہلائے۔آپ نے اردو نظم کی قریباً تمام رائج اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعیات، قطعات، مثنوی، ہجو گوئی وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔چوں کہ آپ قصیدے کا فطری ذوق اور رجحان رکھتے تھے اس لیے اردو شاعری میں بہ طور قصیدہ نگار آپ کو مقبولیت دوام حاصل ہے۔

آپ نے اردو قصیدے کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔آپ کے قصائد میں معنی آفرینی، پرواز تخیل، بہاریہ، رندانہ و مستانہ تشبیب، شان و شکوہ اور طمطراق تاثیر پائی جاتی ہے۔

مرزا رفیع سودا بہ طور غزل گو اپنے منفرد اور عمدہ نشاطیہ آہنگ کے مالک ہیں۔ہم اگر کلیات سودا کا بہ غور مطالعہ کریں تو ہمیں اس چمن میں ہر رنگ اور ہر ادا کا پھول نظر آئے گا جس کی خوشبو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے۔

گلستان کلیاتِ سودا میں دل کش تشبیہوں اور اچھوتے استعاروں کی رونقیں، مشابہتوں، جذبات نگاری، تلمیحات، پیکر تراشی اور مرقع نگاری کے برگ و بار، خوبصورت انداز اختراع اور لفظیات اور مضمون بندی کے پھول، نکہتِ گل و گلشن، نورِ شمس و قمر، فارسی روایت پر مبنی محاورے، فارسی تراکیب و لفاظی، مرکب الفاظ اور بلا کی تاثیر سے معطر فضا ملتی ہے۔

مرزا سودا کا تعمیر زبان اور اس کی ترویج میں کردار مسلم الثبوت ہے۔ہمارا مخصوص موضوع چوں کہ سائنس ہے اس لیے سودا کے اعتراف فن سے متعلق محمد حسین آزاد کی ایک کیمائی انداز میں کچھ سطور ملاحظہ ہوں

"جن اشخاص نے زبان اردو کو پاک صاف کیا ہے مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے انھوں نے فارسی محاروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسے علم کیمیا کا ماہر مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے اور تیسرا مادہ پیدا کر دیتا ہے کہ کسی تیزاب سے اس کا جوڑ کھل نہیں سکتا۔ انھوں نے ہندی زبان کو فارسی محاروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا۔ اکثر ان میں سے رواج پا گئے۔ اکثر آگے نہ چلے۔ انھی کا زور طبع تھا۔ جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترتیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی اور اسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آیندہ کے لیے وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری، جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔ اسی کی بدولت ہماری زبان فصاحت اور انشاء پردازی کا تمغالے کر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کرسی پائے گی۔ اہل ہند کو ہمیشہ ان کی عظمت کے سامنے ادب اور ممنونی کا سر جھکانا چاہیے"(1)

چند اشعار دیکھیں:

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی(2)

فکرِ معاش و عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے(3)

کیفیت چشم اس کی تجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں(4)

گلا لکھوں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا(5)

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے(6)

نہ جیا میری چشم کا مارا
نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا(7)

میں کیا کروں ادائے غضبناک کا بیاں
بجلی سا میرے سامنے آ کر کڑک گیا(8)

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا

کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا(9)

میرا یہ تحقیقی مضمون مرزا محمد رفیع سودا کے مخصوص اور شاذ و نادر پہلو سائنسی تخیل اور فطری لگاؤ کے بیان پر مبنی ہے۔

کلیات رفیع سودا کو اگر سائنس کے تناظر میں جانچا جائے تو ہمیں کئی اشعار میں فطری بیان اور سائنسی حقیقتوں کا ثبوت ملتا ہے۔

تحریر ہذا میں ہم مرزا محمد رفیع سودا کے اشعار میں، قوت نامیہ، زحل سیارہ، بگولا، شرار برق، شرار شعلہ یعنی لاوا، خوف آب، عناصر و مرکبات، دوائے تلخ اور نرگسیت وغیرہ جیسی اصطلاحات کی صورت علم نباتات، علم حیوانات، علم فلکیات، علم کیمیاء، علم طبعیات اور علم نفسیات کا احاطہ کریں گے۔

تمام جانداروں مثلاً نباتات اور حیوانات وغیرہ میں فطری طور پر پھولنے پھلنے اور نشوونما کی طاقت پائی جاتی ہے۔ یہ طاقت قوت نامیہ(Faculty of growth) کہلاتی ہے۔ قوت نامیہ کی اصطلاح مقبول ماہر علم حیاتیات مسٹر ڈارون کے نظریہ ارتقا سے متعلق ہے۔ فطرت نے نباتات، حیوانات اور انسانوں میں جسمانی طور پر ہر پہلو سے آگے بڑھنے اور نمو پانے کی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کے محرکات میں غذا اور ہارمونز اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماحول میں اطراف وجوانب یا موسم بہار میں کسی باغ میں جتنے پھول، پھل، کونپلیں، چھوٹی بڑی شاخیں اور ٹہنیاں دکھائی دیتی ہیں ان سب میں اسی قوت کا کرشمہ ہے۔ نباتات فوٹو سینتھیسز کے عمل کے ذریعے اپنی غذا خود تیار کرتے ہیں اور یہی غذا تمام تنے میں پہنچ کر قوت نامیہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ تہہ خاک تاریکی میں ننھا سا نہال بیج جب لگایا جاتا ہے تو اس کے تناور شجر تک کی صورت اختیار کرنے میں قوت نامیہ کلیدی اور قوت نمو کا کردار انجام دیتی ہے۔

دوسری طرف حیوانات اور انسانوں میں بھی نمو اسی قوت کے سبب یقینی ہوتی ہے۔ مرغ کا بچہ ہو یا انسان کا، سب ہی شکم مادر میں اسی قدرتی قوت کے سبب جسمانی پرورش کے مراحل طے کرتے ہیں۔

قوت نامیہ کی اس اصطلاح کو مرزا سودا نے کس قدر عمدگی سے سائنسی آہنگ کے ساتھ آراستہ کر کے موسم بہار کی مناسبت سے بیان کیا ہے۔

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا ہے پھل(10)
حدِ ایام کی بس از مددِ نامیہ سے
بچہ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل(11)
برگ پیدا کرے تا باغ میں ہر ایک نہال

پھوٹے تانامیہ سے شاخِ شجر میں کونپل(12)

زمین بہار کے موسم میں اس قدر زرخیز اور جوشِ روئیدگی کی طاقت حاصل کر چکی ہے کہ گاو جس کے سینگ پر زمین کھڑی ہے۔اس سینگ سے بھی زمینی مٹی کے جوش روئیدگی سے کونپل پھوٹ پڑا ہے۔

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں

شاخ میں گاوزمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل(13)

قدیم دور میں ایک مذہبی اسرائیلی تصور تھا کہ زمین سارے جہان کا مرکز ہے اور یہ زمین خود کسی گائے یا بیل کے سینگ پر نصب ہے جبکہ خود گائے کسی مچھلی یا کچھوے کے پیٹ پر کھڑی ہے۔

لیکن اس فرسودہ اور بے بنیاد تصور کی حقیقت ماسوائے من گھڑت کہانی کے کچھ نہیں۔ مرزا رفیع کا دور اٹھارویں صدی پر مبنی ہے اس لیے اس دور میں یہ تصور عام تھا کیوں کہ سائنس ابھی شروعات کے مراحل میں تھی لہذا اگلی صدیوں میں ہمیں معلوم ہوا کہ زمین نہ ہی سارے جہان کا مرکز ہے اور نہ یہ کسی گائے کے سینگ پر نصب ہے بلکہ زمین ایک آزاد سیارہ ہے اور کائنات کا چھوٹا سا حصہ ہے۔

زمین کے ساتھ کئی اور بھی سیارے موجود ہیں جو اپنے اپنے مدار میں محوِ گردش ہیں۔سیاروں کی اپنی زاتی کوئی روشنی نہیں ہوتی یہ سورج اور ستاروں کی روشنی منعکس کرتے ہیں جس کی وجہ سے روشن دکھائی دیتے ہیں۔انھی میں سے ایک سیارہ زحل ہے۔زحل کو دور قدیم میں علم نجوم والے سیاہ اور سست ستارہ تصور کرتے تھے۔

جبکہ دور جدید میں معلوم ہوا کہ زحل سیارہ ہے لیکن کچھ کچھ مشابہتیں قریباً درست رہیں مثلاً زحل کا سیاہ اور سست ہونا۔کیوں کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ سیارے خود سیاہ یا بے نور ہوتے ہیں ان کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہوتی۔زحل کی رفتار سب سے سست تو نہیں لیکن دیگر چند سیاروں سے کم ضرور ہے۔

مرزا رفیع سودا امام علی علیہ السلام کی مدح میں کہتے ہیں کہ

مہر سے جس کے منور ہے یہ دل جوں خورشید

رو سیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل(14)

یعنی کہ جو امام علی سے عقیدت رکھتا ہے اس کا دل خورشید یعنی سورج کی مانند چمکتا دمکتا ہے اور جو کوئی بغض وعناد رکھے اس کا دل اور چہرہ زحل سیارے کی مانند سیاہ رہتا ہے۔

زحل کی رفتار کے بارے ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ

میخ سے نعل کی اس کے میں اگر دوں تشبیہ
کرے دوری کو تمام اپنے بیک آن زحل (15)

کیوں کہ امام علی کا گھوڑا برق رفتار تھا مرزا کی مراد یہ ہے کہ امام علی کے کے گھوڑے کے نعلین یا صم سے زحل کو اگر تشبیہ دوں تو زحل لمحوں میں گھوڑے کے نعلین کے صدقے اپنی دوری یا گردش کو مکمل کرلے۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ رفیع جانتے ہیں کہ زحل کی رفتار دیگر سیاروں سے کم ہے۔

تمام آسمانی مخلوق یا افلا کی اشیا حرکت میں ہیں اور یہ حرکت مدام ہے۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے، کہکشاں اور دیگر مصنوعی افلا کی اجسام بھی آسمانی اصول کے تحت متحرک ہیں۔ مرزا سودا اس فطری اصول سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اپنے اشعار میں محبوب کی نسبت سے ان کا بیان بھی کرتے ہیں

پھرتے ہیں رات دن خراب گردشِ چشم میں مدام
رشک سے تیرے مہر و ماہ خانہ بہ خانہ کو بہ کو (16)
جستجو کر کے تجھ آفت کو بہم پہنچایا
باز آتے نہیں گردش سے یہ افلاک ہنوز (17)

مرزا کے ایک شعر سے بگ بینگ تھیوری کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ کائنات کی ابتدا اور اس کے وجود پر کئی نظری مباحث موجود ہیں لیکن اس ضمن میں سائنس کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ بگ بینگ تھیوری ایک اہم ترین تھیوری ہے جس کے نتیجے میں یہ تمام کائنات اور ہزار قسم کا مادہ (مٹی) وجود میں آیا۔

سودا نے اس کے لیے "چاک" کا لفظ برت کر مذکورہ تھیوری کی نسبت کو اجاگر کیا ہے

دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی
ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی (18)

مردہ انسان اور جانور، گلے سڑے پھل اور پودے جب زمین میں دفن کیے جاتے ہیں تو زمین کی مٹی ان سے قوت نمو اور زرخیزی حاصل کرتی ہے کیوں کہ بل الخصوص انسان اور جانور کے اجسام وٹامنز اور دیگر مفید مرکبات کا تانا بانا ہوتے ہیں۔ زمین میں دفن ہونے کے بعد یہ حسین ترین اور تازہ لالہ و گل کی صورت نکلتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو شہر خموشاں ہرا بھرا دکھائی دے گا۔ اس سائنسی عمل پر مبنی ذہن سودا کا شعری کمال دیکھیے

لالہ و گل سے نہ پوچھو یہ زمینِ سرخ رنگ

خونِ ناحق نے ہماری خاک سے مارے ہے جوش(19)
گل زمیں سے نکلتا ہے برنگِ شعلہ
کون جاں سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز(20)

سودا کے اشعار میں تصوف کے تناظر میں سحاب(بادل) کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی گرج چمک یا شرار برق-Thunder) (storm-effect اور سنگ یا پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہونے والے چنگاری (Stones fire due to friction) کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس میں کوہ سے موسی کی نسبت تلمیح کو احسن انداز سے اپنایا گیا ہے یہ دونوں روشنی کی صورت خدا کے نور ہونے یا اسکی تجلی کی نشانیاں ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

غافل غضب سے ہو کے، کرم پر نہ رکھ نظر
پُر ہے شرارِ برق سے دامن سحاب کا(21)
ہر سنگ میں شرار تیرے ظہور کا
موسی نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کی(22)

عام خیال میں بنیادی طور پر چار اجزا مٹی ہوا پانی اور آگ اس کائنات کی بناوٹ میں اہم سمجھے جاتے ہیں۔ انسان کا جسم بھی انھی اجزا سے بنا ہے مگر سودا کے بقول عاشق چوں کہ ہمہ دم بے چین اور اضطراب کی کیفیت میں جلتا کڑھتا ہے اس لیے گویا ہوتے ہیں کہ

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا(23)

جدید سائنس کے زوایے سے دیکھا جائے تو سودا کا مصرع اولی مذید وسعت پاتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم مختلف عناصر و مرکب سے مل کر بنا ہے جس میں ہر طرح کے بنادی عناصر جیسے آئرن، کاربن، کیلشیم، پروٹینز اور دیگر وٹامنز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اردو شاعری میں محبوب کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ ادبا و شعرا نے محبوب سے جڑی تمام کیفیات احساسات کا ذکر کیا ہے۔ محبوب کا ذکر اور محبوب کا سامنے آنا باعث سکون سمجھا جاتا ہے اور حقیقی سائنس بھی یہی ہے۔ دوسری طرف محبوب اگر لعن طعن کرے، ملامت کرے یا گالیاں دے تو ان دشنام کو بھی گلے کا ہار سمجھا جاتا ہے۔ سودا نے اسی تصور کو یعنی محبوب کی دشنام کو کڑوی یا تلخ دوا سے تشبیہ دی ہے۔

بخشے ہے یوں دل کو میرے تقویت دشنام یار

جوں دوائے تلخ سے پاوے بیمار فیض(24)

یہاں سے سودا کے علم ادویات (Pharmaceutical knowledge) کا ادراک ملتا ہے کہ ادویات بے شک اپنے کیمائی ساخت اور اور تلخ اجزا شامل ہونے سے کڑوی ہوتی ہیں لیکن باوجود اس کے بیمار کے لیے فیض اور شفا کا کام دیتی ہیں۔

ایک شعر میں ماہر تشخیص مرض کے طور پر سامنے آتے ہیں، شعر ہے کہ

پند سے تیری زاہد! حال مرا یہ مے سے ہے

سگ کا گزیدہ جس طرح دیکھ ڈرے ہے آب کو(25)

سگ گزیدہ سے مراد کتے کا کاٹا ہوا ہے۔ جب کوئی درندہ صفت کتا یا ہلکان کتا کسی انسان کو کاٹتا ہے تو اس انسان کے اندر (rabies) وائرس داخل ہو جاتا ہے جو انسان کے دماغی خلیات اور اعصاب پر حملہ کرتا ہے۔ انسان کی غدودیں اور گلا سوجھن کا شکار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کچھ کھا اور خصوصاً پی نہیں سکتا کیوں کہ اسے شدید تکلیف ہوتی ہے اور جب وہ پانی کو دیکھتا ہے تو نفسیاتی و جسمانی طور پر خوف کھاتا ہے۔ اس بیماری کو (Hydrophobia in rabies) کہتے ہیں۔ لیکن اسے تشبیہ کے طور پر سودا نے برتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے زاہد جب تو شراب نوشی کے بارے پند و نصیحت کرتا ہے اور اس کے نقصانات بتاتا ہے تو شراب کو دیکھ کر میرا حال بھی ایسا ہو جاتا ہے جیسے کوئی سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے۔

نرگیست نفسیاتی اصطلاح ہے جس کے معنی الفتِ زات، خود پسندی اور خود پرستی ہے۔ اس پر مبنی اشعار دیکھیے

میں عاشق اپنا اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے

گھے پروانہ اس مجلس میں گاہے شمع محفل ہوں(26)

پوج مجھے اس دیر کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو

مجھ وحشی کو سنا بر ہمن بتوں نے اپنا رام کیا(27)

گرمیوں میں بعض اوقات شدید ہوا افقی سمت میں خاک یعنی گرد و غبار کو بھی اپنے ساتھ اٹھالے جاتی ہے جسے بگولے کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں (Tornado) کے نام سے مقبول ہے۔

کیا جانیے کس عالی دور انکی ہے یہ خاک

اٹھتا ہے بگولا جو ہوا ڈھیر ہوا پر(28)

اپنے کلام یا محبوب سے اپنی باتوں کی تاثیر کے حوالے سے لاوا (megma) کی ایک جھلک اور تشبیہ دیکھیے

اثر ان باتوں نے تجھ میں نہ کیا سن کے جنھیں

سنگ سے نکلے شرر شعلہ شرر سے باہر(29)

آتش فشاں کے ظاہر ہونے کے پس منظر میں کئی سنگریزے اور چٹانیں اس انتہائی درجہ حرارت پر پگھل کر سیال مائع میگما میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ان چنیدہ اشعار میں سائنسی معلومات کے کئی راز منکشف ہوتے ہیں۔ جو آفاق میں سودا کی کلاسیکل اور فکری و فنی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔

بہ قول سودا

ہُنر ہے گرچہ فنِ شاعری آفاق میں سودا
اگر نادان کو پہنچے تو اس میں عیب ہو پیدا

حواشی

1۔ محمد حسین آزاد، مولانا؛ آب حیات، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، سن اشاعت: ستمبر 2015ء، ص:143-2144

2۔ مرزا محمد رفیع سودا، انتخاب کلیات سودا(اردو)؛ مرتبہ :فاروق ارگلی، نئی دہلی : ناشر فرید بک ڈپو، سن اشاعت اول: ستمبر 2005ء، ص290

3۔ ایضاً؛293

4۔ ایضاً؛185

5۔ ایضاً؛37

6۔ ایضاً؛282

7۔ ایضاً؛68

8۔ ایضاً؛75

9۔ ایضاً؛60

10۔ ایضاً؛383

11۔ ایضاً؛383

12۔ ایضاً؛389

13۔ ایضاً؛383

14۔ایضاً:384

15۔ایضاً:386

16۔ایضاً:206

17۔ایضاً:117

18۔ایضاً:227

19۔ایضاً:124

20۔ایضاً:117

21۔ایضاً:40

22۔ایضا:34

23۔ایضاً:60

24۔ایضاً:128

25۔ایضاً:199

26۔ایضاً:161

27۔ایضاً:76

28۔ایضاً:105

29۔ایضاً:111

30۔ایضاً:52

منٹو کے افسانوں میں خاندان کی مذہبی اور ثقافتی حیثیت

وجیہہ ضمیر

منٹو کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی توانائیاں تب و تاب تھی ان کا علم حاضر جواب بھی مسلمہ جس طرح تحریر کو ہمیشہ سربلند رہے تھے نوبازی میں بھی وہ ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلتے تھے ان کے ذہن کی تیزی وجڈت اور شدت نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ منٹو بھری محفل میں بلا کسی جھجھک کے بات کہنے کی ہمت رکھتے ہیں انہیں اپنے ادبی قدو قامت کا بی احساس تھا اس لیے بڑوں بڑوں کی بزم میں بھی ان کا انداز بے باک اور بے تکلفانہ اور بے حجابانہ رہتا تھا اور ان کی شوخی طبعی کے آگے سب بے بس ہو جاتے تھے۔ منٹو نے مذہب پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا اور یہی مذہبی قواعد کی پابندی تو کبھی سوچ لیا تھا لیکن اسلام کے ساتھ والہانہ عشق تھا انہوں نے ہمیشہ مذہب کے نام پر کئے گئے مظالم کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا وہ ایک انسان دوست تھے وہ حقائق سب سے بڑے ترجمان تھے تقسیم ملک کے جو حالات رونما ہوئے تھے اس سے نقدی شکل ہو چکا تھا وہ اپنے آپ کو یہ قدیم ہندوستان کا وارث سمجھتے تھے کسی بھی معاشرے میں رہنے والے لوگوں کا آپس میں تعلق بہت ضروری ہے جنم لیتا ہے درحقیقت انہی تعلقات کی تشکیل سے معاشرہ جنم لیتا ہے تاہم تعلق کی بھی خام ہوتی ہیں اور سب سے اہم رشتہ خونی رشتہ ہوتا ہے

منٹو نے اپنے افسانوں میں اس کے بارے میں بہت ذکر کیا ہے ویسے غور سے جائزہ لیا جائے تو اس کے افسانوں میں خاندانی رشتوں کا بیان موجود ہے منٹو کے افسانوی مجموعہ "خالی بوتلیں خالی ڈبے" میں موجود ایک افسانہ "ٹو" ہے۔ اس میں والدین اور اولاد کا آپس میں رشتہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ابتدائی مکالمہ بہت دلچسپ ہے اقتباس ملاحظہ ہو

"میں سوچ رہا ہوں دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردعمل کیا تھا؟ دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتمائی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا میں بھی خالق ہوں" 1 میاں بیوی کا رشتہ دنیا میں سب سے زیادہ پائیدار رشتہ ہوتا ہے جس کے تجربے اور جغرافیہ تک پہنچنا ناممکن ہے یہ رشتہ اللہ نے کیا خوب بنایا ہے مضبوط اتنا فور سے زیادہ اور کم زور اتنا جیسے مکڑی کا جالا جان نہ پہچان رشتہ داری نہ ہو اجنبی نکاح کے بعد ایک رشتے میں بن جاتے ہیں ہیں کہ زندگی بھر ایک دوسرے کے لئے جیتے مرتے ہیں اسلام نے بھی اس رشتے کو بہت اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "تم ان کے لیے لباس ہو اور وہ تمہارے لیے لباس ہیں" 2 اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت یعنی میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے اب اس کا اصلی مقصد جسم کو ڈھانپنا ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میاں بیوی کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی خامیوں کو پردے میں رکھیں کہ وہ بی بی کو چاہیے اس کا واویلا نہ مچائے بلکہ اس کو چھپائے منٹو ایک افسانہ "باسط" ہے اس میں میاں بیوی کا ذکر ملتا ہے جس میں ایک کردار بعثت کا دوسرا سعیدہ کا ہے ان کی آپس میں شادی ہو جاتی ہے وہ

بہت شرمیلی اور خاموش رہتی ہے۔ باسط اس کو سمجھاتا ہے کہ تم اتنی شرمیلی کیوں ہوا ہے تم میری بیوی مگر اس کے زیر اثر نہیں ہوتا وہ چھپ چھپ کر کوئی دوا کھاتی ہے واسطے اس کی وجہ بھی پوچھتا ہے مگر وہ اس کو کچھ نہیں بتاتی شروع میں باتیں تو اس کو میں چھوڑ آتا ہے کہ نئی نویلی دلہن ہے اس وجہ سے زیادہ شہرت ملی ہے اصل بات یہ ہوتی ہے کہ سیدہ شادی سے پہلے ہی حاملہ ہوتی ہے وہ اس بچے کو گرانے کے لیے بھی اس کا استعمال کرتی ہے آخر کار اس کے شوہر کو علم ہو جاتا ہے مگر بعثت کا رویہ ایک روایتی شوہر سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ "سعیدہ کو اطلاع پہنچی تو اس کو اپنی ماں کے ساتھ آنا پڑا وہ اس طرح زرد تھی پہلے سے زیادہ نڈھال بعثت کو بہت ترس آیا اس سے کہا صحیح ہے جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رونا بند کرو اور جاو اندر لیٹ جاؤ" 3 ابھی تو فسانے میں منٹو نے مرد کو آروائے کے ساتھ پیش کیا ہے مذہب کہتا ہے کہ اگر عورت بد کردار ہو جب بات بھی بد کردار ہو تو دونوں کو چاہیے کہ علیحدگی اختیار کر لی یہاں تک کہ اسلام زناکاری کی سزا بھی مقرر کرتا ہے وہ مذہب سے انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ ثقافتی رویہ ضرورت بن گیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ منٹو کو اہم غیر ملکی حقیقت پسند ناول نگاروں سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا اپنی ادبی زندگی کا آغاز میں منٹو نے روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں کو پڑھا اور ان کا ترجمہ کیا اس طرح ان افسانہ نگاروں کے ہاں اسے زندگی کی حقیقی آپ نے ایسا رنگ روپ میں بے نقاب ملیں گے منٹو کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ منٹو ان افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری سے براہ راست متاثر تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ منٹو کے افسانوں میں نثر نگاروں کی جھلک نظر آتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منٹو نے ان کی تقلید کی بلکہ اس طرح منٹو کی حقیقت نگاری اپنے آئڈیل روسی افسانہ نگار چخوف اور فرانسیسی افسانہ نگار موپساں سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ حسن عسکری منٹو کا موازنہ موپساں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جس بات میں منٹو موپساں سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ موپساں کی نثر ہے وہ موپساں کی جس قسم کی نثر درکار تھی وہ فرانس میں اور کچھ نہیں تو کوئی دو سال سے نشو نما پا رہی تھی۔ منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اردو نثر کی روایت میں موجود نہ تھیں منٹو کو پانی پینے کے لیے اپنے آپ کو کنواں کھودنا پڑا۔ منٹو نے جو کنواں کھودا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی اور اس میں جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری ہی سہی مگر دو باتیں ایسی نہیں جن سے انکار کیا جا سکتا ایک تو یہ کہ کنواں کھودا ضرور دوسرا یہ کہ اس میں پانی نکالا اب زرا گنتے تو سہی کہ اردو کے کتنے ادیبوں کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی جا سکتی ہیں "4 ادارہ معاشرے میں اس کی حیثیت بیان کی ہے وہاں عورت کی پارسائی اور وفاداری کے موضوع کو قابل تحریر کرایا ہے اور اس پر روشنی ڈال کر واضح کیا ہے کہ ہر عورت بے وفا نہیں ہوتی ایسی مثالیں منٹو کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ عورت کیسی پارسائی اور وفاداری کا ثبوت منٹو کے افسانے "ماہی گیر" میں بیان کیا گیا ہے. ماہی گیر افسانے میں بیوی کا نام نہیں بتایا گیا اس افسانے میں یہ دکھایا گیا کہ ماہی گیر کی بیوی اپنے شوہر کی محنت کے باوجود تنگدستی میں مبتلا ہے۔ ماہی گیر سارا دن ساری رات محنت کرتا ہے مگر پھر بھی غربت نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں وہ اپنی اولاد کے لیے بھی پریشان ہے کے

مستقبل میں ان کا بھی یہی مشغلہ ہو گا وہ اللہ تعالی سے اپنے شوہر کی آفیت کی دعا کرتی ہے اور کہتی ہے مالک دودھ کی حفاظت اور میرے بچوں کی بھی حفاظت فرما اپنے شوہر اپنی اولاد کے لیے بہت فکر مند رہتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ "اے خدا۔۔۔۔۔۔۔! اے بے کسوں اور غریبوں کے خدا ان بچوں کا واحد سہارا، رات کا کفن اوڑھے سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے م موت کے عمیق گڑھے پر پاؤں لٹکائے ہے۔۔۔۔۔۔۔ صرف ان کی خاطر وہ ہر روز اس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے۔۔۔۔۔ اے خدا تو اس کی جان حفاظت میں رکھیو۔۔۔۔۔ آہ! اگر یہ صرف نوجوان ہوتے اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے !"5 اب اس میں ایک شعر کے ساتھ باپ کے کردار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ باپ اپنی اولاد کے لیے دن رات محنت کرتا ہے تاکہ کے بچے بھوکے نہ رہیں پر تنقید کرنا یا تحقیق کرنے سے پہلے اس دور کی تاریخی سماجی سیاسی اور مذہبی حالات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل کے حالات ایسے تھے کہ مذہبی ٹھیکیداروں نے مذہب کے نام پر عوام کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھی تھی ریاکاری عام ہو گئی تھی مزدوروں کا خون چوسا جا رہا تھا سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و ستم کی انتہا کو پہنچ چکے تھے اور صرف عیاشی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا ان حالات میں عوام کے دلوں میں مذہبی منافرت پیدا کر دی تھی ترقی پسند تحریک کے اثرات نے فنکاروں کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ شاعر اور ادیب ان مذہبی پابندیوں اخلاقی اور سماجی خدمات کو پار کر گئی تھی اور اپنے غم و غصے کا اظہار تک لو اور نظم دونوں میں کر رہی تھی ادب آزاد ہو گیا تھا فنکار آزاد ہو گئی تھی ان آزادیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فنکار تمام کی پابندیوں سے آزاد ان کی جاتی تھی اسی دور کے مذہبی اخلاقی اور مالی پابندیوں کے خلاف اپنی تخلیقات میں سخت احتجاج کے رویے کو اپنا لیا تھا۔ اردو ادب اور زندگی سے قریب لانی زندگی کی عکاسی اور ترجمہ بنانے اور اس کی تنقید حیات کا درجہ دینے میں ترقی پسند نمایاں کردار ادا کیا ہے کہ 36 میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی پریم چند کی پہلی کانفرنس کی صدارت لکھنؤ میں کی سجاد ظہیر، ملک راج آنند وغیرہ ادیب اس انجمن سے وابستہ تھے۔ اس تحریک کی مقبولیت یہ تھی کہ "انگارے" کے افسانوں پریم چند کے افسانے "کفن" پر وفیسر مجیب کا افسانہ "کمیا گر" احمد علی کے افسانوں اور اختر حسین رائے پوری کے مضمون "ادب اور زندگی" نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی زمین پہلے ہی ہموار کر دی تھی ملک کے ہر حصے میں ادیبوں نے گرمجوشی سے اس کی تحریک کی پذیرائی کی "انگارے" کی بعد اردو افسانے میں زبردست لگائی اور اس نے ہر طرح کے موضوعات پر بے باکی سے اظہار کرنے کے دروازے کھول دیئے۔ "انگارے" کے افسانوں میں طنز کا انداز بالکل نرالا تھا اس نے ہر طرح کی منظر نگاری بیان کی گئی ہر منظر میں غریبی قوم پرستی گل و بلبل شاعری مذہب کی اجارہ داری جنت و دوزخ محمود آزادی ارفاق ہر چیز کا ذکر تھا۔ سعادت حسن منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ارباب اربعہ اردو افسانے کے چار ستون تھے جن پر اردو افسانے کی عمارت کھڑی تھی۔ منٹو زبردست ہوا تیرادی کا مالک تھا اس نے اپنے ارد گرد سیاسی حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بے خوفی کے ساتھ اپنے افسانوں میں نامساعد حالات کا ذکر کیا۔ در حقیقت

منٹو انسانی زندگی کو عذاب یہ نظر سے دیکھتا ہے منٹو نے بہت زیادہ قسم پرسی کی زندگی بسر کی اور معاشرتی زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانوں میں بہت ہی تلخ واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں جن کو کسی بھی قیمت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ منٹو نے طوائف کو بھی عورت کے روپ میں پیش کیا ہے کی اس کے اندر اچھائی اور نسائی جذبات سے لوگ ناواقف ہیں م منٹو نے عورت کے اعلی اخلاقیات و کردار پر بھی روشنی ڈالی اور لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی۔ دوسری طرف اگر ایک بیوی اور طوائف کے حوالے سے حاصل ہونے والی آسانیوں اور سہولتوں کا تقابل "نطفہ "کا ایک مرد کردار ہوں کہتا ہے بیوی گھریلو اور سگی قسم کی ہو تو آدمی اسے گالی نہیں دے سکتا اگر رنڈی ہو تو گندی سے گندی گالی بھی دی جا سکتی ہے رنڈی کا کھوٹا اور گھریلو گھر۔۔۔ زمین آسمان کا فرق۔۔۔ معاشرہ ایک مرد کو اس قدر چھوٹ دیتا ہے کہ وہ نئے جنسی لطف کے لیے اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں طوائفوں کو گھر میں لا سکتا ہے۔ لیکن "بارش" "چانکی" "ہتک" اور "پشاور سے لاہور تک" کے مردوں کی طرح بحثیت بیوی انہیں مستقل جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن سلطانہ (کالی شلوار) جانکی سوگندھی "فوھابائی "برمی لڑکی "جیسی طوائفوں میں ایک گھریلو عورت ذندہ ہے۔ وہ عورت گھر کی طرف شدید جھکاؤ محسوس کرتی ہے۔ بحثیت ایک طوائف کہ وہ مرد کے استحصال سے واقفیت کے باوجود وہ شادی کے بندن میں بندھنا چاہتی ہے۔ مردانہ اخلاق کے حامل سماج کی جبریت سے مواقفت اور قبولیت کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ یعنی بحثیت بیوی یا طوائف دونوں طرح سے مرد کا ظلم سہتے رہنا عورت کی مجبوری ہے۔ ایک طوائف کا ہاں ہر مردانہ استحصال اخلاقی و معاشی سطح پر شدید تر ہوتا ہے جبکہ موافقت Adjustment کے حوالے سے بحثیت بیوی ایک مرد کے استحصال اخلاقی ہونا دراصل ایسے سماجی دھارے میں انا ہے یہاں ان جیسی سینکڑوں بے بس عورتوں پر ظلم پھر ظلم نہیں لگتام بلکہ مذہبی، اخلاقی، اور سماجی، اخلاقی، سماجی اور قانونی جواز اور تحفظ حاصل ہونے کے باعث طوائف ہونے کی بدنامی اور تنہائی سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے گو اسے طوائف جتنی حاصل آزادی اور محدود دائرے کو بھی رنگ دینا پڑتا ہے منٹو کے نزدیک بنیادی اہمیت انسان ہے نہ کہ مذہب اور دھرم۔ انسانیت اور انسان دوستی ہی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ منٹو کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں جو بظاہر فسادات پر لکھی گئی ہیں مگر آفاقیت کی حامل ہیں محمد حسن عسکری نے ان کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ان میں منٹو کے چھوٹے چھوٹے لطیفے زیادہ ہولناک ہیں اور سب سے زیادہ رجائیت امیز ہیں منٹو کی دہشت اور رجائیت کی بجائے سیاسی لوگوں یا انسانیت کے نیک دل خادموں کی رجائیت نہیں ہے بلکہ ایک فنکار کی دہشت اور رجائیت اور اس کا تعلق بحث و تمحیص یا تفکر سے نہیں ہے بلکہ ٹھوس تخلیقی تجربے سے ہے اور یہی منٹو کے افسانوں کا واحد امتیاز ہے۔ منٹو کا ایک افسانہ "کتاب کا خلاصہ "اس میں موجو کردار نملا جو ہندو لڑکی کے اس کا مسلمانوں کے گھرانا جانا جگ اس کا باپ سکول ماسٹر ہے جس کا نام لالہ ہرن چرن ہے تقسیم ہند سے پہلے مسلمان اور ہندو مل جل کر رہتے تھے اسم میں

کسی قسم کا تفرق نہیں تھا یہاں بھی مذہب کو اہمیت نہیں دی جارہی۔ انور، سعیدہ اور شمیم یہ تینوں بہن بھائی کا نملا سے بہت لگاؤ تھا اچانک نملا سہمی سہمی رہنے لگی اور اس کا رویہ آن لوگوں سے بدل گیا وہ کسی کو کچھ نہیں بتاتی بلکہ اندر ہی اندر بات کو دبائے رکھتی ہے اچانک ایک دن پتہ چلتا ہے کہ نہر کنارے ایک نومولود بچہ کی لاش پڑی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نملا کا بچہ ہے جبکہ اس نومولود بچے کا باپ خود ماسٹر لالہ ہرن چرن نکلتا ہے

"بڑی بدر و میں ایک نوزائیدہ بچہ مرا ہوا پایا گیا تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ بچہ لالہ ہرن چرن سکول ماسٹر کی لڑکی نملا کا ہے اور بچے کا باپ خود لالہ ہرن چرن تھا۔۔۔سب کر سکتہ چھا گیا "

منٹو کے کرداروں کے مطالعہ سے زندگی کے تلخ حقائق کا ادراک بآسانی کیا جاسکتا ہے اس کے افسانوں کے بیشتر کردار مذہبی تقاضوں پر پورا نہیں اترتے وہ ایک خاص دائرے میں گردش کرتے ہیں ان کے مسائل اپنی ذات سے شروع ہوتے ہیں اور اپنی ذات پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ منٹو نے ہر لحاظ سے معاشرت اور مذہبیت کی مکمل تصویر لوگوں کو دکھائی ہے بلکہ جھوٹ اور پردہ پوشی سے کام نہیں لیا بلکہ تلخ حقائق کا نہایت قریبی سے جائزہ لینے کے بعد انہیں لوگوں کر آشکار کیا ہے۔ دراصل منٹو کے افسانوں کے کرداروں میں انسانوں کے حقیقی چہروں کا عکس بہت واضح ہے جس کی وجہ سے معاشرے ناچاہتے ہوئے بھی جھٹلا نہیں سکتا یہ حقائق اس قدر واضح ہیں کہ انسان کو کبھی کبھار ان سے نفرت ہونے لگتی ہے منٹو ایک بلند پایہ کی مایہ ناز شخصیت کا نام ہے۔

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ___ ایک جائزہ

عبداللہ نعیم رسول پی۔ایچ۔ڈی اسکالر

نظریاتی حوالے سے دنیائے ادب سید احتشام حسین کو ایک ترقی پسند ادیب کے طور پر جانتی ہے۔ آپ کی ادبی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں، آپ نے افسانہ، مضمون، تاریخ، تنقید، ڈراما اور سفر نامہ لکھا۔ زیرِ نظر ان کی کتاب "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" ہے۔ کتاب کے نام سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو ادب کی تنقید کی تاریخ ہے جبکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کی کتاب ہے، تنقیدی تاریخ تو صرف نام ہے، تاریخ بھی ایسی جو نامکمل، تحقیق سے دور کا واسطہ نہیں۔

یہ کتاب کئی بار اشاعت کے عمل سے گزر چکی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں اس کتاب کی پہلی اشاعت ہوئی جبکہ زیرِ نظر اشاعت دسویں ہے جو انڈیا (نئی دہلی) کے ادارے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ اس اشاعت کے ۳۴۱ صفحات ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان پروفیسر سید علی کریم نے لکھا۔ مذکورہ کتاب ۱۴، ابواب پر مشتمل ہے جو ترتیب وار درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔	اردو زبان اور ادب کی ابتدا	۲۔	اردو، دکن میں
۳۔	دلّی، اٹھارویں صدی میں	۴۔	اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل
۵۔	اودھ کی دنیائے شاعری	۶۔	نظیر اکبر آبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا
۷۔	قدیم دلّی کی آخری بہار	۸۔	اردو نثر: فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد
۹۔	نئے دور سے پہلے: نظم اور نثر	۱۰۔	نیا شعور اور نیا نثری ادب
۱۱۔	نشاط ثانیہ کی اردو شاعری	۱۲۔	نظم میں نئی سمتیں
۱۳۔	نثر کے نئے روپ	۱۴۔	موجودہ ادبی صورتِ حال

اردو زبان و ادب کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے سید احتشام حسین ہندوستان میں مختلف قوموں کی آمد اور ان کی بولیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً دراوڑوں اور آریاؤں کی آمد، ان کی ثقافت اور زبانیں، سنسکرت، پراکرت (ملی جلی بولیاں)، پالی، ماگدھی، شورسینی زبانیں اور بولیاں۔ برِ صغیر میں مختلف قومیں اپنی زبانوں اور ثقافت کے ساتھ ساتھ لسانی و ثقافتی تبدیلیاں لائیں۔ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ (مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی) جدید زبانوں کی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اردو کے ارتقا کے بارے مصنف کا خیال ہے [۱] کہ یہ زبان مختلف زبانوں اور بولیوں کے ملاپ سے وجود میں آئی اور مختلف زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہوتے گئے تا آں کہ یہ اردو کی شکل میں واضح ہوئی۔ ابتدا میں یہ زبان اردو، ہند، ہندی، ہندوی، زبانِ دہلی، دکھنی، گجراتی، ریختہ، زبانِ

اردو اور زبان اردوئے معلی کے نام سے موسوم رہی۔ اردو زبان و ادب کے ابتدائی نقوش بابا فرید، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ شرف الدین بو علی قلندر، امیر خسرو، شیخ سراج الدین، شیخ شرف الدین منیری، مخدوم اشرف، شیخ عبد الحق ردولوی، گیسو دراز، سید محمد جون پوری، شیخ بہاؤالدین باجن اور شاہ ہاشم ایسے صوفی شخصیات سے ملتے ہیں۔ ان صوفیا کے کلام میں ہندوستانی (اردو) زبان کے کئی الفاظ موجود ہیں۔

سید احتشام حسین کے مطابق اردو نثر کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معروف تصنیف "معراج العاشقین" پندرھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی اور یہ اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ گیسو دراز کے پوتے عبداللہ حسینی نے "نشاط العشق" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ میراں جی شمس العشاق نے "شرح مرغوب القلوب"، برہان الدین جانم نے "کلمۃ الحقائق"، "ہشت مسائل"، "ذکرِ جلی"، خلیفہ امین الدین اعلی نے "گنجِ مخفی" تحریر کی۔ اس کے علاوہ میراں جی خدا نما، محمد قادری نور دریا، میراں حسینی، شاہ معظم نے بھی اردو میں نثر لکھی۔ ان تمام مصنفین کے رسائل اور کتب میں عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات عالمِ دین تھے، دوسرا یہ کہ ان کتابوں کا موضوع تصوف، معرفت اور طریقت ہے۔ دکن کی نثری تاریخ کی بحث میں چند ایک ناموں کا بیان تو ہے مگر جو نام لکھے ہیں ان میں سے بھی بعض ادیبوں کی کتب یا رسائل کا ذکر موجود ہے باقی ندارد۔۔۔ قاری تشنگی محسوس کرتا ہے۔ (دکن کی اردو نثر پر مفصل کام ہونے والا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمیل جالبی[۲]، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[۳] نے دکن کی نثر پر اپنے تئیں تحقیق کی ہے۔)

دکن کی اردو شاعری میں ہمیں جو صنف سب سے زیادہ ملتی ہے وہ مثنوی ہے۔ نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ"، رستمی کی "خاور نامہ" کے علاوہ ملک خوشنود، دولت شاہ، عبدل اور مقیمی کے نام ملتے ہیں۔ بیجاپور میں نصرتی اور ہاشمی معروف شاعر ہو گزرے۔ نصرتی نے تین مثنویاں "گلشنِ عشق"، "علی نامہ" اور "تاریخِ سکندری" لکھیں۔ ہاشمی نے "یوسف زلیخا" لکھی۔ گولکنڈہ کے کئی بادشاہ شاعر تھے اور ادب کی از خود سرپرستی کرتے تھے۔ یہاں زیادہ تر مرثی[۴] لکھے گئے۔ گولکنڈہ کی تاریخ شاعری میں ایک اہم نام قلی قطب شاہ ہے جو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اسی عہد میں ملّا وجہی ایک اہم فارسی شاعر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس نے اردو میں بھی لکھا۔ اس کی مثنوی "قطب مشتری" اور نثری تصنیف "سب رس" بہت معروف ہوئی[۵]۔ دوسرا بڑا شاعر غواصی ہے جس نے "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" مثنویاں لکھیں۔ ابنِ نشاطی نے "پھول بن" لکھی۔ شاعری میں دکن کا پہلا بڑا شاعر ولیؔ، دوسرا قاضی محمود بحریؔ اور تیسرا بڑا شاعر سراج الدین اورنگ آبادی ہوئے۔

دہلی میں شاعری کا پہلا باقاعدہ دور پہلے مغل بادشاہ محمد شاہ سے شروع ہوتا ہے جو کہ خود بھی شاعر تھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان کے دربار سے بہت سے شاعر وابستہ تھے جیسے ابو الفضل، فیضی، عرفی، نظیری وغیرہ۔ دلی میں فائز[٦]، آبرو، ناجی، حاتم، مظہر جان جاناں[٧]، مضمون، تاباں درد، سودا، میر اہم شاعر ہوئے۔

''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کا اسلوب اردو تذکروں جیسا ہے۔ شاعر کا مختصر تعارف بتا کر اس کا نمونہ کلام دیا جاتا ہے۔ مثلاً

''ناجی کا نام سید محمد شاکر تھا۔ یہ نواب امیر خاں کے یہاں سپاہیوں میں تھے۔ ان کی طبیعت کا رجحان ظرافت اور مزاح کی طرف بہت تھا اور کہا جاتا ہے ہر وقت ہنسی کی ایسی باتیں کرتے تھے، جن سے روتے ہوئے لوگ ہنس پڑتے تھے مگر وہ خود نہ ہنستے تھے۔ تقریباً ۱۷۵۴ء میں ان کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی''۔[٨]

نمکین حسن دیکھ کر پی کا رنگ گل کا لگا مجھے پھیکا

آج تو ناجی سجن سے کر تو اپنا عرض حال مرنے جینے کا نہ کر وو سواس، ہوتی ہے سو ہو

اہم شاعروں درد، سودا، میر کا تذکرہ نسبتاً تفصیل سے کرتے ہیں، جس میں پیدائش سے انتقال تک کے حالات کے علاوہ ان کے مجموعوں کے نام اور شاعری پر رائے دیتے ہیں، مگر ان کی رائے خالص تنقیدی نہیں ہوتی صرف محاسنِ کلام کا ذکر کرتے ہیں۔ میر کے بارے لکھتے ہیں

''وہ اکبر آباد (آگرہ) میں تقریباً ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک صوفی فقیر تھے۔ بچپن سے ہی میر دن رات صوفیوں اور عالموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ان کی باتیں سنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔۔۔ چھ دیوانوں کے علاوہ میر کی اور بھی کئی کتابیں ملتی ہیں جو فارسی میں ہیں۔ ذکرِ میر، نکات الشعرا، فیضِ میر فارسی نثر میں ہیں اور بڑی تاریخی اور ادبی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک فارسی مجموعہ کلام بھی ملتا ہے۔ میر نے اپنی زندگی تکلیف اور بدحالی میں گزاری تھی اس لیے انھیں اجڑی ہوئی دلی کی علامت کہنا غلط نہ ہو گا۔۔۔ میر آج تک غزل کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے شعر تیر کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔ سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزا اور مٹھاس، اتنا زہر اور اتنی تلخی دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری اور جذبات کا اتنا طوفانی جوش تخلیق شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پر اثر مرثیے بھی کہے ہیں مگر ان میں غزلوں کی المناک فضا نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں جن میں ان کا معیار محبت واضح ہوا ہے۔ مگر بادشاہ وہ غزل ہی کے ہیں کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں حالت اک اضطراب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے پچھتاؤ گے سنو ہو! یہ بستی اجاڑ کے[۹]

اسی طرح میر کے آٹھ مزید اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ یوں میر کا ذکر پانچ چھ صفحات تک چلا جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے احتشام حسین کے پاس جو معلومات تھیں وہی کتاب میں درج کر دیں گئیں، حقائق تک پہنچنے کا تردد نہیں کیا گیا۔ ادیبوں اور شاعروں کے بہت سے ادبی پہلو اور ادبی کارناموں کے بارے اہم معلومات کتاب میں موجود نہیں، گویا تحقیقی نقطۂ نظر کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جالبی نے کہا تھا کہ "پروفیسر احتشام حسین اردو کے اہم نقاد ہیں۔ لیکن ان کا رشتہ چونکہ تحقیق سے قائم نہیں تھا اسی لیے ان کی تحریروں میں بہت سی بنیادی باتیں غلط اور نادرست مفروضات پر کھڑی نظر آتی ہیں"۔[۱۰] اوپر دیے گئے اقتباس کی پہلی سطر کو ہی دیکھیں، میر کی تاریخِ ولادت یوں درج کرتے ہیں "(میر) تقریباً ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے" لفظ "تقریباً" سے پتا چلتا ہے کہ ان کی بات میں تشکیک کا عنصر ہے۔

اودھ (لکھنؤ) کا تذکرہ کرتے ہوئے جرأت، انشاؔ، رنگینؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، آتشؔ ایسے غزل گوؤں کے علاوہ مرثیہ نگاری کی روایت میں انیس و دبیر کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہیں، اسی عہد میں مثنوی کا ایک بڑا نام میر حسن سامنے آیا۔

"اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں زمانی ترتیب موجود ہے۔ اودھ کے شاعروں کے بعد وہ پھر سے دلی کے آخری دور کے شعرا کا ذکر کرتے ہیں جن میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ کو شامل کرتے ہیں۔ یوں علاقائی اور دبستانوی تقسیم بھی قائم ہو جاتی ہے۔

احتشام حسین نظیر اکبر آبادی کو نظم میں نئی روایت کا بانی قرار دیتے ہیں اور ان کے عہد کو نظم کی ترقی کا عہد کہتے ہیں۔ شاعری کے قدیم اور جدید دور کے وسط میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مجروح، داغ، امیر مینائی کے نام درج کرتے ہیں اور نشاۃ ثانیہ میں حالی، آزاد، اکبر الہ آبادی، اقبال، شاد، ریاض خیر آبادی، فانی، عزیز، ثاقب، اصغر، حسرت، جگر، یگانہ وغیرہ کو شامل کرتے ہیں۔ بارہویں باب "نظم میں نئی سمتیں" میں رومانی شاعر اور ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔ رومانی میں جوشؔ، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور ترقی پسندوں میں فیض، مجاز، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اور

قاسمی کا ذکر موجود ہے۔ فراق کو ترقی پسند مصنف لکھتے ہیں جبکہ ان کا نام رومانی شعراء کے ساتھ کرتے ہیں۔ حالاں کہ شاعری میں فراق جدید شاعر تھے۔ اگرچہ ان نظم نگاروں نے نثر کی اصناف میں بھی لکھا مگر مصنف نے بالخصوص نظم کو ہی موضوع بنایا ہے۔

شاعری کی تمام اصناف کے بارے بتاتے ہیں جن میں غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی، قطعہ، قصیدہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح نثر کی اصناف مضمون، ناول، ڈراما، سوانح، سیرت، تاریخ وغیرہ۔۔۔ ان کے خیال میں اردو نثر کو انیسویں صدی میں فروغ ملا، فورٹ ولیم کالج اور سرسید تحریک نے اردو نثر کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا، جس میں حالی، شبلی، نذیر ایسے اہم نام شامل تھے۔

ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ معاشرہ ادب پر اثر انداز ہوتا ہے اور ادب معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی لیے احتشام حسین بار بار سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کو موضوع بناتے ہیں اور پھر ان حالات کی وجہ سے زبان وبیان کی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً آٹھویں باب کی ابتدا یوں کرتے ہیں

"ادبی نثر کے لیے جس طرح کا ماحول ہونا چاہیے وہ آہستہ آہستہ ہندوستان میں پیدا ہو رہا تھا۔ اٹھارھویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی تھی اور زندگی نئے حدود کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مغل سلطنت کی کمزوری کے باعث اس کھنڈر پر نئی طاقتیں نئے راج محل کھڑے کر رہی تھی۔ مگر سب کے سب جاگیر دار سماج کی معاشی بنیادوں پر قائم تھے۔ اسی دور کے اندر ایک بدیسی طاقت بیوپار کی راہ سے دیس پر چھائی جا رہی تھی۔ اس کے عمل دخل نے نئے معاشی مسائل کو جنم دے کر زندگی میں نئے بحران اور خیالات میں نئے دھارے پیدا کر دیے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے جوڑ توڑ کے مقابلے میں ہندوستان کے بدحال وبدعنوان بادشاہ اور امرا نہ ٹھہر سکے۔ تجارتی مراعات کی ظل عاطفت میں برطانوی راج کے پروردہ نئے سرمایہ داروں نے وہ جال بچھایا جس میں نہ صرف ہندوستان کی دولت پھنس کر رہ گئی بلکہ پوری زندگی ہی اپنے مرکز سے ہٹ گئی۔۔۔ اس نئے ماحول میں انگریزوں نے ایسا جادو کیا کہ ہندوستانی مزاج کے زندگی سے مطابقت پیدا کر لینے اور منظم ہونے والے رجحان دب سے گئے۔ ہونے کو تو ملک میں شجاع الدولہ، علی وردی خاں، حیدر علی، مراٹھے، نظام، مغل، راجپوت، سکھ، روہیلے اور جاٹ سبھی تھے، مگر یہ کبھی کسی مقصد پر متحد نہ ہو سکے بلکہ ایک دوسرے سے جنگ کر کے کمزور ہوتے چلے گئے یا انگریزوں نے انہیں شکست دے دی۔"[۱۱]

اس اقتباس سے پروفیسر احتشام حسین کا ادبی تاریخ نویسی کا نظریہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ادبی تاریخ نویسی کے لیے ادب کو سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ گویا وہ ادب میں سائنٹفک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ صرف داخلی کیفیات وجذبات تک ادب کو مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ ان کے ہاں خارجی ماحول بھی ادب کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی کا مضمون "تہذیب۔ ادب اور احتشام حسین" اہم مضمون ہے۔

آزاد، حسینی میاں ظریف، محمد عبداللہ، مرزا نظیر بیگ، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، پنڈت بیتاب، آغا حشر کاشمیری، شرر لکھنوی، پنڈت کیفی، امتیاز علی تاج وغیرہ نے اردو ناٹک لکھ کر اسے ترقی دی۔

مولوی عبد الحق، سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، لالہ شری رام، شیرانی، عندلیب شادانی، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، عبد القادر سروری، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو تحقیق و تنقید کو فروغ دیا۔

اردو ادب کو رسائل و جرائد اور اخبارات نے بھی ترقی دی۔ ایسے ادیب جنہوں نے ان ذرائع سے ادب کو پھیلایا ان میں عہدِ متوسطین میں سے مولوی محمد باقر، سر سید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبد القادر، مولوی عبد الحق اہم نام ہیں۔

"نثر کے نئے روپ" میں انیسویں صدی کے اہم افسانہ نگار پریم چند کے افسانوں اور مجموعوں کے نام لکھنے کے بعد اسے ترقی پسند قرار دیتے ہیں جبکہ پریم چند ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہے۔ ترقی پسندوں نے اکثر یہی کیا کہ جہاں کہیں انصاف اور معاشرتی طبقات کی بات نظر آئی وہاں ترقی پسند کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اسی لیے وہ اقبال کو بھی ترقی پسند شاعر کہتے ہیں۔ حالاں کہ ترقی پسند ایک خاص نظریے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کا بالخصوص ذکر کرتے ہیں مثلاً احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں۔۔۔ علاوہ ازیں کرشن چندر، منٹو، بیدی، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، ممتاز مفتی، حسن عسکری، عزیز احمد، ہنس راج، مرزا رسوا، ڈاکٹر احسن فاروقی، عظیم بیگ چغتائی وغیرہ ادیبوں کے افسانوں اور ناول کے علاوہ اس دور کے ناقدین فراق، مجنوں، آل احمد سرور، ممتاز حسین، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر وقار عظیم، نور الحسن ہاشمی کے ادبی کارناموں کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔

آخری باب "موجودہ ادبی صورتِ حال" میں نئی شاعری، نیا افسانہ، نیا ناول اور نئی تنقید پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان اصناف پر مغربی ادب کا خاصا اثر ہے، ایک طرف ہمارے ہاں مغربی ادب کی طرز پر لکھا جانے والا ادب ابہام کا باعث بن رہا ہے تو دوسری طرف نئی چیزیں بھی سامنے آ رہی ہیں۔ مذکورہ باب میں تقسیمِ ہند کے عرصے کے ادبا کا بیان ہے۔ جن میں ہندوستان اور پاکستان کے اہم ادیب شامل ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ادبی تاریخ کی کتاب معلوماتی ضرور ہے پر تحقیقی نہیں۔ کیوں کہ تحقیقی طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ بعض شخصیات کی ولادت و انتقال کی تاریخیں ہی درج نہیں۔ متنازع بیانیہ موجود ہیں۔ تنقید بھی تاثرات تک محدود ہیں۔ ترقی پسند ادب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ ہے اور تذکروں کی طرز کی نثر معلوم ہوتی ہے۔

کتاب ستّر کی دہائی تک کے ادبا و شعرا کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کے آخر میں نہ کوئی حوالہ ہے اور نہ ہی کتابیات جس سے اس کا تحقیقی ہونا ثابت ہو۔ تنقیدی حوالے سے اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کتاب تاریخ کی ایک عام سادہ سی کتاب ہی محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب میں بہت سے ایسے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں جو قابلِ بحث بھی ہیں اور قابلِ اصلاح بھی۔ لیکن ایسا ہر کتاب میں ہوتا ہے۔ سوائے اللہ رب العزت کے کوئی شے مکمل نہیں اور تحقیق میں تو اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ گنجائش رہتی ہے اور در کھلے رہتے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ نصیر الدین شاہ ہاشمی کے مطابق اردو کا خمیر دکن سے اٹھا، سید سلیمان ندوی اردو کا ابتدائی مقام سندھ کو قرار دیتے ہیں، حافظ محمود شیرانی کا نظریہ پنجاب میں اردو کا ہے جبکہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو کا آغاز دہلی میں دیکھتے ہیں۔

۲۔ تاریخ ادبِ اردو (جلد اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع چہارم: ۱۹۹۵ء

۳۔ اردو نثر کا آغاز و ارتقا (انیسویں صدی کے اوائل تک)، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مجلس تحقیقاتِ اردو حیدر آباد، س۔ن

۴۔ کیوں کہ گولکنڈہ میں اہلِ تشیع کی حکومت تھی۔

۵۔ اردو زبان میں نثری صورت میں لکھا جانے والا پہلا قصہ۔

۶۔ احتشام حسین کے مطابق فائز پہلا شاعر ہے جس نے اپنا مجموعہ خود مرتب کیا۔

۷۔ ایہام گوئی کی مخالفت کی اور سادہ گوئی کی تحریک چلائی۔

۸۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سیّد احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، انڈیا، ۲۰۱۶ء

۹۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ایضاً

۱۰۔ ادبی تحقیق، جمیل جالبی، ڈاکٹر، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۹۴ء

۱۱۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سیّد احتشام حسین، ایضاً

تبصرے

"تاریخ ادبیاتِ سیالکوٹ" ایک مطالعہ

شاکر کنڈان (سرگودھا)

دریائے چناب جو چن اور آب کا مرکب ہے۔ نیز چندرا اور بھاگا دو دریاؤں کے ملنے سے وجود میں آیا، ایک طرف تو (چن اور آب) حسن وخوب صورتی کا استعارا ہے تو دوسری طرف (چندرا بھاگا) معنوی لحاظ سے چاند کی قسمت لیے ہوئے ہے۔ اسی لئے اسے دریائے حسن وعشق کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ حسن اور عشق لازم وملزوم ہیں۔ یعنی جہاں حسن ہوتا ہے وہاں عشق ہوتا ہے۔ حسن میں جمالیات اور عشق میں جمالیاتی حظ اور ذوق ہوتا ہے۔ یہ حظ اور ذوق تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ شاعری اور ادب چوں کہ تخلیقی عمل ہے، لہٰذا اس سارے سلسلے کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں دریائے چناب کا تعلق ہے تو اسے دانشورانِ عصر نے بہت سوچ سمجھ کر دریائے حسن وعشق کا نام دیا ہے۔ کیوں کہ اس کے کناروں پر آباد بستیوں میں بسنے والوں کو خالقِ کائنات نے حسنِ وافر عنایت فرمایا ہے جس نے عشق کی بنیاد رکھی۔ یہی حسنِ وافر اور عشق ادب کی تخلیق کا باعث ٹھہرا ہے۔ سیالکوٹ بھی دریائے چناب کے کنارے ایک ایسی ہی بستی ہے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ عکسِ زندگی اور نقدِ زندگی کی بھی فراوانی ہے۔ اس دھرتی پر زندگی کا عکس پیش کرنے اور زندگی کو اپنی تنقیدی صلاحیتوں سے نکھارنے والی ایسی ایسی شخصیات نے جنم لیا جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس دھرتی کی پہچان بنیں۔ ان معتبر شخصیات میں سے بہت سا ذکر آپ کو "تاریخ ادبیاتِ سیالکوٹ" میں پڑھنے کو ملے گا لیکن تحقیق میں چوں کہ حرفِ آخر نہیں ہوتا اس لئے اس تحقیق میں بھی کئی نام ایسے رہ گئے ہیں جن کا ادبی مقام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اِس مقالے میں مطالعہ کرتے ہوئے یوں تو تقریباً ۱۵۰ شعراء اور ادباء کا ذکر ملتا ہے لیکن ان میں سے ۲۹ شخصیات کا تعارف دو یا تین بار ہوا ہے۔ یوں کل ۱۱۸ شخصیات کے لگ بھگ ایسی ہیں جن کا تعارف یا نگارشات پر تبصرہ ہمیں پڑھنے کو ملتا ہے۔ مقالے میں اس طرح کی تکرار ابواب بندی کے تحت ضروری ہوتی ہے اور یہی تحقیق کا تقاضا ہے کیوں کہ جب اصناف کی الگ الگ بحث کی جاتی ہے تو جن اشخاص نے کئی کئی اصناف میں کام کیا ہوتا ہے انہیں بار بار مقالے کا حصہ بنانا مقالہ نگار پر فرض بھی ہے، لازم بھی اور مجبوری بھی۔ اس مقالے میں نثر، نظم اور تنقید کو چوں کہ زیرِ بحث لایا گیا ہے اس لئے جن ادیبوں نے تینوں حوالوں سے کام کیا ہے ان کا تعارف تین بار، جنہوں نے دو اصناف میں کام کیا ہے انہیں دو بار شامل کیا گیا ہے۔ بہر حال اسے میں حرفِ آخر کے طور پر محفوظ رکھتے ہوئے یہاں ایک طائرانہ نظر اس مقالے پر ڈالنا چاہوں گا۔ جی ہاں! ڈاکٹر نصیر احمد اسد کو اس مقالے کی اساس اور دفاع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے قابل سمجھتے ہوئے اسے اپنے

نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ لگانے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ آپ کا ایم فل کا مقالہ سیالکوٹ کی شعری پہچان کے حوالے سے تھا گویا تیکنیکی طور پر تو نہیں لیکن نظری طور پر اگر اسے لیڈنگ ٹوپی ایچ ڈی کہہ دیا جائے تو میرے خیال میں عام قاری کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اساتذہ کی بات ایک سپیشلسٹ والی ہے جنرل فزیشن والی نہیں لہٰذا ان کی تشخیص جنرل فزیشن سے واقعتاً مختلف ہو گی۔

"پاکستان کا سٹالن گراڈ" روس کے شہر سٹالن گراڈ سے ہزاروں سال پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ یہ الگ بات کہ اُس کو دوسری عالمی جنگ میں لہو کی ندیاں بہانے کے بعد شہرت ملی اور سیالکوٹ کو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کی ہولناکی دیکھنے اور خون کا نذرانہ دینے کے بعد سٹالن گراڈ کی نسبت دی گئی۔ سٹالن گراڈ کا نام تو دوسری جنگِ عظیم کے بعد تبدیل کر دیا گیا لیکن سیالکوٹ آج بھی دھرتی پر اپنے اصل نام سے موجود ہے۔

نصیر احمد اسد کے اس مقالہ کی تہذیب کے دوران میں باب بہ باب اس کی مشاورت میں شامل رہا ہوں لیکن تکمیلی لمحات کے دوران میں شاید وہاں موجود نہیں تھا۔ میرا اگرچہ وہ قد کاٹھ نہیں ہے لیکن مجھے یہاں اسد کی محبت کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس نے مجھے وہ عزت دی جو شاید میری فکری اپج سے بالا ہے۔ نیز کتابی صورت میں لانے اور اشاعت میں بھی مجھے مشاورت کا شرف حاصل رہا۔ اس پر یہ کہ دیباچہ لکھنے کے لئے ناچیز کا انتخاب میرے ادبی قد کو مزید بڑھانے کا باعث بنا۔

"تاریخِ ادبیاتِ سیالکوٹ" اگرچہ ڈگری کے حصول کے لئے لکھا گیا اور ڈگری کے حصول کے لئے لکھے جانے والے مقالات بڑے محدود ہوتے ہیں۔ اگرچہ تسوید سے قبل مقالہ نگار ذہنی اور فکری طور پر بالکل بالغ ہو چکا ہوتا ہے۔ (قارئین سے گزارش ہے کہ بالغ کو بلوغت نہیں بل کہ بلاغت کے پس منظر میں دیکھا جائے۔) لیکن اس کی یہ وسعتِ فکر و ذہن اس لئے استعمال نہیں ہو سکتی کہ ایچ ای سی کی قیادت لٹریچر سے ان جان ہونے کی وجہ سے سائنسی علوم کی پابندیاں ادب کے سکالر پر بھی لاگو کر دیتی ہے۔ حالاں کہ سائنس میں ۲ + ۲ = ۴ ہیں اور بس چار۔ اس سے شہ برابر بھی اِدھر، اُدھر گناہ تصور ہوتا ہے جب کہ ادب میں ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کبھی سوا چار اور کبھی پونے چار بھی ماننا پڑتا ہے۔ اس پالیسی کے تحت سپر وائزر کا بال پوائنٹ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور جیسے ہی وہ سائنسی اصول کی حد ٹاپنے لگتا ہے۔ فوراً ہی بال پوائنٹ چل جاتا ہے جس کی زد میں کئی اچھے، خوب صورت جملے اور پیرے بھی آ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں نصیر احمد اسد کے سپر وائزر نے اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اسے کھلی تو نہیں لیکن کسی حد تک چھٹی دے رکھی تھی اور یہ اندازہ اس کے مقالہ کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے کہ ساڑھے تین سو صفحات کی مقررہ حد کو اس نے لانگ جمپ (long jump) سے نہیں بل کہ ٹرپل جمپ (triple jump) سے اس قدر ٹاپا کہ مقررہ حد بہت پیچھے رہ گئی یہی وجہ ہے کہ یہ مقالہ صرف شاعری یا فکشن تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کو تھوڑے سے ردوبدل کے

ساتھ اگر الگ الگ ترتیب دیا جائے تو یہ ایک علاقائی تذکرہ بھی ہے ایک تاریخ بھی ہے، جغرافیہ ہے، کتب کا توضیحی اشاریہ ہے ،سیال کوٹ کی ادبی تاریخ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔اس کا کریڈٹ جہاں نصیر احمد اسد کے وسعتِ مطالعہ اور فکری اپج کو جاتا ہے وہیں اُن کے سپر وائیزر کی وسعتِ قلبی کی داد بھی دینی پڑتی ہے۔MOI میں پڑھایا جاتا ہے کہ خود کو ایک مثال کے طور پر پیش کیا جائے تو وہ مثال مؤثر ہوتی ہے۔ سو یہاں میں اپنی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ نصیر احمد اسد کا پی ایچ ڈی کا ڈیفنس جولائی ۲۰۲۱ء میں ہوا۔ میرا پی ایچ ڈی تقریباً اس سے ایک سال قبل ہوا۔ میرے سپر وائیزر بہت فراخ دل تھے اور انہوں نے دورانِ مقالہ مجھے نہیں پوچھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں اور کیسے لکھ رہا ہوں۔ خاکہ کی تیاری کے بعد میں نے کام شروع کر دیا۔ چوں کہ میرے کام میں زمان و مکاں کی قید نہیں تھی لہٰذا پہلا باب میں نے حضرت آدم علیہ السّلام سے حضرت امیر خسرو تک ترتیب دیا۔Pre Defence تک میں اپنا مقالہ تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ جب پری ڈیفنس کے وقت میں نے اس پر بات کی تو وہاں بیٹھے ایک سینیئر ڈاکٹر صاحب نے اسے غیر متعلق قرار دے کر رد کر دیا۔ بہر حال وہ باب "اردو کی بنیاد میں اردو کا حصہ" کے نام سے اسی عرصے میں کتابی صورت میں شائع ہو گیا۔ دوسرا یہ ہوا کہ میرا مقالہ جمع ہو گیا اور رپورٹ پہنچ گئیں۔ ڈیفنس نزدیک تھا کہ ایچ ای سی کا یہ حکم مجھے موصول ہوا کہ مقالہ کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے کسی صورت زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ میرے سپر وائزر نے ان سے بات بھی کی لیکن وہ نہیں مانے۔ میرے لئے مسئلہ یہ تھا ایک سو سے زائد صفحات کتابیات اور ماخذات کے تھے ۔ بہر حال نصیر احمد اسد خوش قسمت ہے کہ اس کے سپر وائزر نے اسے مکمل آزادی دی اور اُس نے کھل کر اپنی خواہش کے مطابق مدتوں سے ذہن میں جو ایک خاکہ بنا رکھا تھا اُسے اوراق پر اُلیک دیا۔

"تاریخِ ادبیاتِ سیالکوٹ" بظاہر پانچ ابواب پر مشتمل ہے لیکن اس میں کئی موضوعات موجود ہیں۔ جس کا ذکر محقق نے خود اپنے ابتدائیہ میں کر دیا ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ مقالہ اپنے اسلوب میں سیالکوٹ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اگر مقالہ نگار خود یا کوئی دوسرا شخص اس کو انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر چند اضافوں کے ساتھ ترتیب دے تو انسائیکلوپیڈیا کی اصل صورت اختیار کر سکتا ہے۔ سیالکوٹ کی اِس ادبی سرگزشت کو

اگر باحق نیازے ہست حاجت نیست تعمیرے: ستون و سقفِ درویشاں ہمیں دستِ دعا باشد

جیسے خوبصورت شعر کے خالق میر زا محمد علی رائج سیالکوٹی جن کا فارسی دیوان، مرکزِ تحقیقِ فارسی ایران و پاکستان نے شائع کیا، سے شروع کر کے ساحل سلہری (پ: ۱۹۸۲ء) کی تنقیدی کتاب "عباس تابش ایک مطالعہ" پر ختم کیا گیا ہے۔ ساحل سلہری کی اس کے بعد بھی چند کتب شائع ہو چکی ہیں لیکن صاف ظاہر ہے وہ اس مقالے کے بعد منظرِ عام پر آئیں۔ یوں زیرِ نظر کتاب میں

سیالکوٹ کے ادبی منظر نامے کے تقریباً تین سو سال کے عہد کو قلم بند کیا گیا ہے۔ نصیر احمد اسد نے رائج سیالکوٹی سے پہلے کے جس شاعر (محمد خان وامق) کا حوالہ دیا ہے میرے علم کے مطابق اس کی ولادت رائج کے بعد کی تسلیم کی جاتی ہے۔

"پاکستان کا سٹالن گراڈ" روس کے سٹالن گراڈ سے صدیوں پر دھرتی کے سینے پر اپنا وجود قائم کر چکا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں سٹالن گراڈ نے اپنے وجود پر لہو کی ندیاں بہتے دیکھیں تو پاکستان کے اس سٹالن گراڈ نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اپنے پیٹوں کو خون میں نہاتے دیکھا۔ اس شہر نے جرأت اور خون کا وہی منظر دیکھا جو روس نے اپنے سٹالن گراڈ میں دیکھا تھا۔ اُس شہر نے اپنا نام اب تبدیل کیا جب کہ یہ شہر شاکل یا شاکلہ سے سل یا سالبان کے آنے کے بعد سیالکوٹ بنا۔ اس شہر نے تاریخ کو تبدیل ہوتے دیکھا، جغرافیہ کو بدلتے دیکھا، سیاست میں تبدیلیاں دیکھیں، جنگوں کے مناظر دیکھے، آرٹ اور مصوری کی نمائشیں دیکھیں، معاشی اور معاشرتی تغیر سے واسطہ پڑا۔ ادب میں نت رونما ہوتی تبدیلیاں دیکھیں اور ان تمام عوامل کا ذکر نصیر احمد اسد نے اپنے اس مقالے میں کیا ہے۔ جس نے مجھے کم از کم اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیا۔ اسد نے مہابھارت میں سیالکوٹ کا نام شامل ہونے کا حوالہ دیا ہے اور اسے پانچ ہزار قبل مسیح کا زمانہ لکھا ہے۔ مہابھارت کو ہم بالکل نارمل لیتے ہیں جب کہ ایسا نہیں۔ اس کے اشلوکوں کی تعداد ۲۵ لاکھ الفاظ بتائی جاتی ہے جو ۱۸ جلدوں پر مشتمل ہے۔ سنسکرت میں ویاس نے است تحریر کیا۔ اس کے کچھ حصوں کے ترجمے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ یہ بھارت خاندان کی بہت بڑی کہانی ہے۔ وکی پیڈیا میں اس کا عرصہ ۲۸ سے ۲۴ صدیاں پہلے، جب کہ مہابھارت کا قابلِ قبول دور ۳۱۰۲ قبل مسیح اور دوسری روایت کے مطابق ۱۰۰۰ قبل مسیح ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافے ہوتے رہے اور یہ عمل ۲۵۰۰ ق۔م سے ۸۰۰ ق۔م تک جاری رہا (روایات میں اختلاف کے باعث ۳۵۰۰ قبل مسیح سے ۸۰۰ء تک کا زمانہ بھی تاریخوں میں لکھا ملتا ہے)۔ جو تھوڑا بہت میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اُن اشلوکوں میں شاکلا یا شاکل کا نام مجھے نظر نہیں آیا۔ ۵۰۰۰ سال قبل مسیح کے حوالے سے دوسری بات جو میں کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ بائبل میں جتنی بھی تحریفات ہو چکی ہوں پھر بھی وہ ہمارے نزدیک مقدس اور قابلِ احترام صحیفہ ہے۔ بائبل یا عہد نامہ عتیق کے پہلے باب (بابِ پیدائش) میں ہمیں پیغمبرانِ الٰہی علیہم السلام کی عمروں کا، ایک نبیؑ سے دوسرے نبیؑ کی پیدائش تک کا وقفہ ایک تسلسل سے مرقوم ہے۔ اس تسلسل کو اگر جمع تفریق کیا جائے تو حضرت آدمؑ کے زمین پر وجود سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک تقریباً ۵۵۱۷ سال بنتے ہیں۔ امام ابنِ عساکر نے حضرت آدمؑ سے حضور نبیِ مکرم حضرت محمد ﷺ تک کا عرصہ ۷۷۳۸ سال لکھا ہے۔ نیز حضرت آدمؑ، حضرت شیثؑ اور دیگر انبیاء پر اتارے گئے صحائف کے علاوہ جس پہلی کتاب کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ اس کا انگریزی میں "Book of the Dead" کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے اور وہ قابلِ قبول حوالے کے مطابق لگ بھگ ۲۲۵۰ سال قبل مسیح میں تحریر ہوئی تھی۔ وکی پیڈیا میں اس کے سنین میں اختلاف ہے۔ لہٰذا ۵۰۰۰ قبل مسیح میں مہابھارت کا لکھا

جانا ذہن کی پہنچ سے باہر ہے۔ پہلی بار میں نے شاکلا کا نام کچھ یوں لکھا ہوا پڑھا۔ "سکندرِ اعظم کے لوٹنے کے بعد کچھ لوگ برِ صغیر میں ہی رہ گئے اور وہ کوہ ہندو کش کے شمال میں آباد ہو گئے۔ (یہ روایت کالاش اور کافرستان کی آبادیوں کے بارے میں ہے) یہ لوگ ۲۵۰ قبل مسیح میں خود مختار تھے اور باختر کے نام سے ایک حکومت قائم کر چکے تھے۔ (اس ریاست کا ذکر مقالہ نگار نے بھی کیا ہے)۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ فتوحات کی غرض سے نکلے اور دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصے کا مرکز بلخ اور دوسرے حصے کا ساگلا تھا (جسے راقم نے مقالہ نگار کے حوالے سے شاکل یا شاکلا لکھا ہے۔) ساگلا کا مشہور بادشاہ مینانڈر تھا جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ بدھ کا پیرو تھا۔ یہی ساگلا، شاکلا یا شاکل سیال کوٹ کا قدیم نام ہے۔" جو بعد میں راجہ سل عرف سلوان یا سالبان کے نام پر سیالکوٹ قرار پایا۔

میں نے جب "تاریخِ ادبیاتِ سیالکوٹ" کا مطالعہ شروع کیا تو میرے ذہن میں سیالکوٹ کے حوالے سے کئی نام گردش کرنے لگے۔ جن کے حوالے سے مجھے یقین تھا کہ یہ نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے۔ اِن میں سے کئی نام تو ہمارے درمیاں گفتگو کا حصہ بن چکے تھے پھر بھی نہ جانے ذہن اُن کی شمولیت کے بارے میں تشکیک کا شکار تھا۔ پہر حال جوں جوں میں مطالعہ کرتا گیا وہ نام ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے آتے گئے اور میں ہر نام کے دیکھنے پر نصیر احمد اسد کی محنت، وسعتِ مطالعہ اور تحقیقی شعور کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر چہ مقالہ کی تہذیب کے دوران کئی شخصیات زیرِ بحث آئیں لیکن نہ جانے مجھے کیوں شک سا رہا کہ یہ نام ممکن ہے مقالہ نگار کو یاد نہ رہا ہو۔ اُن میں سے پہلا نام میلا رام وفا کا تھا لیکن میلا رام وفا کا تعارف اور کلام دیکھ کر اگلی سوچ مجھے بلرام کومل کی آئی لیکن اسے بھی آخری صفحات میں پا کر ساحل سلہری کا نام میرے ذہن میں آیا لیکن اس کا ذکر بھی موجود ہے۔ سدرشن کا نام آیا تو وہ بھی موجود، سجاد نقوی، سبطِ علی صبا اور جوگندر پال کے نام ذہن میں آئے تو وہ بھی موجود۔ پورا مقالہ پڑھنے کے بعد چند نام جو میرے ذہن کے کینوس پر ابھرے وہ نام واقعی یہاں موجود نہیں تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ ۱۹۷۱ء کے لگ بھگ ایک ناول "ہیرا" سیالکوٹ سے شائع ہوا تھا جس کے مصنف محمد نواز تھے۔ میں نے نصیر احمد اسد سے اس کا ذکر بھی کیا تھا لیکن تلاشِ بسیار کے بعد اسے وہ ناول نہیں مل سکا۔ خیر یہ تو ایک غیر رسمی سی بات تھی۔ جو اشخاص مجھے یاد آ رہے ہیں مجھے امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان ادبا و شعرا کو بتحقیق شامل کیا جائے گا۔ شاید ان میں سے کوئی نام کتاب کا حصہ ہو اور میری نظروں سے پوشیدہ رہا ہو۔ لیکن پھر بھی..... تحقیق کا در کبھی بند نہیں ہوتا اس میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی کچھ منہا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہر آنے والا محقق کچھ نئے پہلو لے کر آتا ہے اور نئی چیزیں اجاگر کرتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ مقالہ نگار سے اردو زبان کے شاعر، مصنف ڈائریکٹر، موسیقار، ہندو مسلمان (افسانے)، نکاتِ زباندانی، شہابِ ثاقب، اونسیاں (پنجابی، اردو، ہندی، فارسی۔ مجموعۂ کلام) کے مصنف اور اردو میں پہلا ماہیا لکھنے کے دعوی دار

"ہمت رائے شرما" کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا جنم ۱۹۱۹ء میں سیالکوٹ میں ہوا تھا۔ شاید یہ بات مقالہ نگار کے ذہن سے محو ہو گئی اسی وجہ سے اس کا نام مجھے دکھائی نہیں دیا۔

این اے صوفی ۱۹۴۲ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ مرے کالج سے گریجوایشن کرنے کے بعد ایئر فورس جوائن کر لی اور گروپ کیپٹن کے عہدے سے پنشن یاب ہوئے۔ "روپ، دھوپ اور صحرا"، "پھر وہی دن کا اجالا"، "وارفتہ" (شعری مجموعے)، "ناتمام کائنات" (فلکیات) اور "ایک اور دستخط" (افسانے) وغیرہ آپ کی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

ایک مدت تک ہند و پاک کے ادبی رسائل میں متواتر سے شائع ہونے والے جناب حمید یورش نے بھی ۱۹۲۵ء میں ظفر وال میں آنکھ کھولی۔ میٹرک کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے اور اور میجر کے عہدے سے پنشن پائی۔ ۱۹۸۹ء میں راول پنڈی میں فوت ہوئے۔ زندگی میں ایک شعری مجموعہ "جوئے تشنۂ تلاطم" کے نام سے شائع ہوا۔

محمد طارق طور ۱۹۵۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے نثر میں ظرافت کو پیروڈی کا رنگ دیا۔ "دروغ بر گردنِ قاری" آپ کی پہلی مزاحیہ تصنیف ہے

پیر زادہ سید ظفر ہاشمی کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں چک ہاشمیاں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے نکلنے والے معروف رسالے "عالم گیر" کے معاون مدیر اور امرتسر سے جاری ہونے والے ادبی پرچے "چمنستان" کے مدیر رہے۔ شاعری میں "حسنِ خیال"، "حسنِ کلام"، "تنویرِ عجم" اور "آہنگِ ظفر" جب کہ نثر میں "مقالاتِ ظفر" اور "حسنِ ادب" آپ کی تصانیف ہیں

۔

۱۹۲۲ء میں مترانوالی ضلع سیالکوٹ میں عالمِ ہست و بود میں آنے والی شخصیت انور گوئندی، جس نے کامران مشاعروں اور کامران رسالے کے حوالے سے برِ صغیر میں نام کمایا۔ جس کا کلام اور نگارشات آپ کی وفات کے بہت عرصہ بعد ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے "نوائے انور" کے نام سے یک جا کر کے شائع کروائیں، بھی مقالہ نگار سے کے تحت الشور میں ہی رہ گئے۔

حمایتِ اسلام کے مشاعروں اور صحافتی دنیا میں "اردو زبان" کے اجرا سے پہچان بنانے والے عصمت علیگ بھی ۱۹۲۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ ڈاکٹر وزیر آغا کی محفلوں کی رونق ہوا کرتے تھے۔

"لوح و قلم"، "آئینۂ دل" اور "نوائے سروش" جیسے شعری مجموعوں کے تخلیق کار شیخ غلام حسین قیصر جن کی میّت ۱۴/ اگست ۱۹۷۴ء کو وفات پانے پر اُن کے آبائی شہر سیالکوٹ میں پہنچائی اور دفن کی گئی۔ آپ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے خاندان میں سے تھے۔

اگر ادب کی تعریفات میں سے اس نظریے یعنی "جو چیز احاطۂ تحریر میں آجاتی ہے وہ ادب ہے" کو درست مان لیا جائے تو "مرزائیت اور اسلام"، "قادیانیت"، "بریلویت تاریخ و عقائد"، "الشیعہ و اہل البیت"، "الشیعہ والسنہ" اور "تصوف تاریخ و عقائد" جیسی کتب کے مصنف علامہ احسان الٰہی ظہیر کو ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا اور آپ کا تعلق بھی سیالکوٹ سے تھا۔

اسلم کمال کو آرٹسٹ کے حوالے سے تو جگہ دی گئی لیکن ایک ادیب کی حیثیت نظر انداز ہو گئی۔ آپ کا سفر نامہ "لاہور سے چین تک" کافی مقبول ہوا۔

اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی، ابنِ آدم، ایوب صابر، جگدیش مہتا درد، خوشتر گرامی، ناصر ساحلی، اجیت سنگھ حسرت، مختار صدیقی، بلدیو سنگھ ہمدم، مختار مسعود، نجمہ تصدق، کے ایل ناصر، آصف بھلی، گل شیر بٹ، کلدیپ نیئر، بابا محمد یحییٰ خان، صوفیہ بیدار، مشتاق قریشی، فاروق قیصر، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق، سوشیل کمار رام پال، سعید پسروری، سراج الدین آذر اور کئی دیگر صاحبانِ کتب بھی مقالے میں شامل نہ ہو سکے۔ شکر گڑھ جو ۱۹۹۱ء تک سیالکوٹ کا حصہ رہا، اس وقت تک کے ادبا اور شعرا کو شاید دانسہ نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ اب سیالکوٹ کا حصہ نہیں رہا۔ جیسے پنڈت ترلوک چند، سرور ارمان، شفیق چغتائی، رشید میواتی اور یعقوب انجم وغیرہ۔

یہاں صرف یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ آئندہ مقالہ نگار خود یا کوئی اور محقق سیالکوٹ کے حوالے سے کام کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان نکات کو ذہن میں رکھے۔ جیسا کہ قبل ازیں میں عرض کر چکا ہوں کہ تحقیق میں کچھ بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا مزید کہ جامعاتی تحقیق میں جب کہ آپ کے پاس وقت محدود ہے اور آپ کو پابندیوں کی حد میں رہ کر اپنا کام سمیٹنا ہے۔ آپ کے پاس محدود ذرائع ہیں۔ ماخذات کی تلاش میں سفر بھی کرنا ہے۔ مصاحبہ و مکالمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ایک دانہ اکٹھا کرنا ہے۔ بعض اوقات آپ سات سو صفحے کی کتاب کھنگال لیتے ہیں اور آپ کو اپنے مقصد کی ایک سطر بھی نہیں ملتی سو ایسے حالات میں مایوسی بھی اپنا گھیرا تنگ کر لیتی ہے، تو محقق اس حصار میں جو کچھ ملتا ہے اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان حالات کے تحت نصیر احمد اسد نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھرپور کوشش کی اور وقت کو استعمال کرتے ہوئے مقالہ کو بہتر سے بہتر بنایا۔

ڈاکٹر نصیر احمد اسد نے مقالے کی ترتیب میں عہد اور زمانے کا لحاظ رکھتے ہوئے تاریخی تحقیق کے ضمن میں روایت کو برقرار رکھا ہے۔ یہ کام کسی بھی دوسری تحقیقی ترتیب کی نسبت کافی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ بعض شخصیات کی تاریخ ولادت یا وفات تو الگ عہد کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ خاص کر پرانی کتابوں کی اشاعت کے ایڈیشنز اور تحریر کے سنین میں بہت اختلاف ہوتا ہے یہاں تک کہ قدیم ایڈیشنز میں مصنفین کے نام تک نہیں ملتے۔ گویا تاریخی حقیقت کی پرکھ میں لانا مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن ہو جاتا

ہے۔اسد نے اسے فطرت کے مطابق پیش کرنے میں کافی محنت سے کام لیا ہے ،اگر کہیں اسقام موجود بھی ہیں تو وہ مجبوری کے باعث۔ڈاکٹر اسد کا اسلوبِ نگارش نہایت سادہ، شگفتہ اور دلکش ہے۔پڑھنے والا تحریر سے اکتاتا نہیں اور اگر قاری کا تعلق سیالکوٹ سے ہے یا ادب سے وابستہ اور ایسی تحریروں کے پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اِس سہل، سادہ اور نہایت صاف ستھری زبان اور انداز سے پورا حظ اٹھاتا ہے۔

اشفاق نیاز کے بعد سیالکوٹ کو اس انداز میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے روشناس کرانے اور عزت و توقیر دینے پر ڈاکٹر نصیر احمد اسد کے اس کام کو سراہنا چاہیے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ آئندہ اس کام کی تکمیل کر سکے اور جو عوامل وقت کی کمی کے باعث رہ گئے ہیں انہیں شامل کرتے ہوئے سیالکوٹ کا ایک انسائیکلوپیڈیا مکمل کر سکے۔

☆☆

افسانچہ

اجازت

شاہد اشرف

"یہ راستہ آگے چل کر چشمے کی طرف نکلتا ہے "راہگیر یہ کہ کر آگے بڑھ گیا. میں شش و پنج میں مبتلا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ رستے پر گامزن ہو گیا. اس نے کہا تھا کہ. تھوڑے فاصلے پر چشمہ ہے اور چشمے کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا. میں تھکن, پژمردگی اور مایوسی سے پہلے ہر حال میں چشمے تک پہنچنا چاہتا تھا. پختہ سڑک کے بعد یہ راستہ زائرین کو پیدل طے کرنا پڑتا تھا. آخر کار چشمہ آ گیا. میں نے پانی پیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا. اُس نے مجھے یہاں تک آنے کے لیے کہا تھا,اس کے بعد مزار تک پہنچنے کا فاصلہ مجھے اس کے ساتھ طے کرنا تھا. وہ میرے بعد چشمے پر پہنچا اور آتے ہی بولا " آؤ چلیں " ہم چل پڑے اور راستے میں باتیں کرتے رہے. ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے دور سے مزار کی طرف اشارہ کیا اور پھر نامعلوم منزل کی جانب گامزن ہو گیا۔ میں مزار کی طرف بڑھنے لگا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا۔ میں جتنا مزار کے قریب جاتا ہوں۔ مزار اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتا ہے۔ میں نے تیز بھاگنے کی کوشش کی اور میرا سانس پھول گیا. میرے پاؤں بوجھل ہونے لگے اور میں حسرت و یاس کے عالم میں مزار کی طرف دیکھتا رہا. مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے باریابی کی اجازت نہیں ہے. میں اپنے بعد آنے والوں کو مزار کی سمت جاتے دیکھتا ہوں۔ سب مجھے حیرت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ میں خستہ حال اور تہی دست ایک عمر سے وہاں پر رکا ہوا ہوں.

افسانہ

بندھن کا بوجھ

ثمینہ سید (لاہور. پاکستان)

"اس سے پہلے کہ آپ ہمیں کہیں سیر کے لیے لے جاتے, یا ہمارے ساتھ باہر کی دنیا میں سانس لیتے. کچھ یادگار وقت بتاتے. یہ دن آ گئے. اور اب..... آپ بھی اس قید کے ہاتھوں بے بس ہیں. بہت شوق تھا اکیلے صبح سے شام بلکہ رات گئے تک مٹر گشتی کا. اب کیجئے جناب."

شفق نے مسکراتے ہوئے گہرا طنز کیا. تو حبیب احمد اسے گھور کر رہ گئے. جز بز ہوتے اٹھے اور غصے سے بولے

"بچوں کے سامنے میری بے عزتی کرنے سے فرصت ملے تو ایک کپ چائے لاؤنج میں پہنچا دینا.. اور ہاں ملازمہ کے ہاتھ بھیجنا."

"جی اچھا" شفق نے شانے اچکائے. ان رویوں نے اسے بھی لاپرواہ بنا دیا تھا. وہ اس خوش فہمی سے نکل آئی تھی کہ بیوی نہ چاہتے ہوئے بھی "ملازمہ "بنی رہے تو دل میں جگہ بنا ہی لے گی.. کچھ دیر بیٹھی رہی بچوں کی کھلی کتابوں میں دلچسپی کی کوئی چیز, کچھ نیا ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی. کیونکہ پچھلے ایک سال سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا. وبا کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں, آن لائن کلاسز, کھانے پکانے, ایکدوسرے کی ہی شکلیں دیکھنا, بے وقت چائے اور طنزیہ بک بک.

کبھی کبھار سکول والوں کے پرزور اصرار پر شفق اور حبیب احمد کو سلیقے سے تیار ہو کر کمپیوٹر کے آگے بھی بیٹھنا پڑتا. والدین کی حیثیت سے بہت سی چیزیں سمجھنا پڑتیں اور کئی طرح کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے. وہ خود بہت ذہین فطین طالبہ تھی. ہمیشہ پہلی پوزیشن پہ اسی کی اجارہ داری رہتی تھی. یونیورسٹی میں بھی گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا. اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسکے ابا اس کی پسند اور دل چسپی کو ترجیح دیتے تھے. اسی کی منتخب کردہ سمت میں اسے چلنے دیا جاتا تھا. نا صرف اس کا ساتھ دیتے پیسہ بھی لگاتے. لیکن نجانے کیوں ناز نخرے اٹھانے والے یہی والدین بیٹیوں کی شادی کے وقت روایت پسند اور کٹھور بن جاتے ہیں. وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی ایم فل, پی ایچ ڈی کے بعد شادی کرنے کا سوچنا چاہتی تھی. لیکن امی کو خدشوں کے ناگ ڈستے رہتے. لڑکی کی عمر زیادہ ہو جائے گی تو اچھا رشتہ نہیں ملے گا.. اسکی سوچ پکی ہو جائے گی تو ہماری نہیں سنے گی اور سب سے بڑھ کر تو امی کو شیطان کے شر سے خوف آتا رہتا. اکثر کہتیں

"شیطان انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے ہر پل نجانے کب حاوی ہو جائے. ہماری نانی کہتی تھی برائی اور بے راہ روی تو قبر کی دیواروں تک پیچھا کرتی ہے. مرتے مرتے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے. اور ہم پڑھنے کی آزادی دے کر لڑکیوں کو شتر بے مہار کر چھوڑتے ہیں."

"تو اللہ کا نام لے کے رشتہ ڈھونڈ بھلئیے لوکے.... میری بیٹی میرا فخر ہے,مان ہے میرا. مجھے کبھی شرمندہ نہیں کروائے گی. "ابا جی کہتے تو شفق کی آنکھیں بھر آتیں.

تب ان باتوں کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے یہ خدشے یہ مان کے تالے عقل سے ماورا لگتے تھے لیکن اب.....اب جب وہ ایک بڑے بزنس مین حبیب احمد کی بیوی بن چکی تھی. دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی. تو گاہے بگاہے امی کی باتیں دل کے دروازوں پہ دستک دیتی رہتی تھیں.

"امی حق بجانب تھیں. لیکن شادی کرتے وقت بیٹی کی پسند, عمر اور ذوق کا خیال رکھ لیتیں تو.....کیا برائی تھی.. "شفق اکثر کام نپٹاتے اسی طرح کے فقرے بڑبڑاتی رہتی تھی.

بچے سکول چلے جاتے اور میاں صاحب کروفر سے تیار ہو کر اپنے کام پہ چلے جاتے. اس کے سسرال والوں کی ایک بڑے مال میں کروڑوں روپے کی دکانیں اور بزنس تھے. اونچی سے اونچی اڑان ہوتی. ایکدوسرے سے بڑی گاڑیاں, کئی کئی کنال پہ پھیلے گھر, میک اپ زدہ چہرے, باہر کے کھانے اور دنیا بھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی. باہر سے پڑھ لکھ کے آئے نوجوان بھی اسی بزنس میں لگ جاتے. سب پہ دو کو چار کرنے کی دھن سوار تھی. کمی تھی تو محبت کی اور شدید کمی تھی تو ساتھ کی, تعلق میں خلوص کی اور زندگی میں ٹھہراؤ کی. جو شفق جیسے مڈل کلاسیوں کا خاصا بڑا مسئلہ تھا. وہ چاہتی تھی حبیب احمد اسے اور دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر دنیا دکھائیں. اکٹھے بیٹھ کے کھانا پینا, دیر تک باتیں کرنا اور اپنی مرضی کے پکوان بنانا جیسے.. عام سے خواب تھے. وہ مرد کے ساتھ کو حصار کی طرح اپنے گرد لپیٹنا چاہتی تھی.

لیکن ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے نوکر تھے. کھانے کی ہدایات خانساماں کو دی جاتیں. حبیب احمد اکثر طنز کے تیر چلاتے رہتے.

"یہ مڈل کلاسیے شوق کہیں دفن کر دو شفق بیگم. اسٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ پر توجہ دو. اس گھر گرہستی کی یا سگھڑاپے کی ضرورت نہیں ہے مجھے..

اور ہاں گاڑی خود چلانا سیکھو,پیسہ خرچ کرنے کے طریقوں پر غور کرو. وہ جو تمہاری ذہانت تھی ناں اس کی یہاں کسی کو بالکل بھی ضرورت نہیں ہے. زندگی کے ساتھ دوڑنا سیکھو تاکہ میری بچیوں کی اچھی تربیت کر سکو. فیشن اور ٹیکنالوجی کا دور ہے بی بی...رٹو پن اور ذہانت کے زعم میں رہنے کا نہیں".

شفق نے اپنی اخلاقیات اور تربیت کے مطابق نجی زندگی کا آغاز کیا تھا,رشتوں کو بنانے اور نبھانے کی ہر کوشش کر دیکھی تھی. لیکن یہاں سب اپنی مرضی اور اپنی پسند کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے. ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے کی سر توڑ کوشش میں تھا. وہ کبھی ان سب کے ساتھ بھاگنے لگتی. شاپنگ,پارلرز,پارٹیاں,فیشن شوز,سوشل ورک..ہوٹلنگ سب کچھ کرتی اور کبھی تنہائی کے صحراؤں میں نکل جاتی. بے اعتنائی کے سرپٹ گھوڑے اس کی خاک اڑاتے. تو وہ گم ہوتے ہوتے گمراہ ہونے لگی. مضطرب روح کے چین کے لیے راستے ڈھونڈنے نکل پڑتی.

بے شمار طنز اور روکھے رویے شفق کے رگ وپے میں اترتے اور زہر بھرتے جا رہے تھے. گھر میں ہر طرح کا آرام اور سہولتیں تھیں جن کی وجہ سے ہر دیکھنے والی آنکھ شفق کو خوش قسمت کہتی. کوئی کیا جانے ان کے رشتے میں کتنی گھٹن اور سرد مہری تھی. حبیب احمد تعلق کی انتہا پہ بھی اسے "ناشکری عورت" کہتے ہوئے الگ ہوتے. جو لمحے ان کو درکار ہوتے ان میں شفق پوری طرح انکا ساتھ نہیں دے پاتی تھی. جب جب شفق کو تنہائی تنگ کرتی وہ انہیں احساس دلانے کی کوشش کرتی وہ کبھی توجہ نہ دے پاتے.

انسان مشین بن کر ہر ضرورت پوری کر سکتا ہے. لیکن جذبے.....ان کی اپنی سرکشی ہے,اپنی مرضی,اپنا ہی رچاؤ. ان پر زور زبردستی نہیں چلتی. اگر زبردستی کرنے کی کوشش کی جائے تو تعلق تڑک کر رہ جاتا ہے اور منہ زور ہواؤں کی طرح مرضی کے رخ پہ نکل جاتا ہے....یہی شفق کے ساتھ ہو رہا تھا. تمام پیسے والوں کی طرح اسے بھی ڈپریشن ہونے لگا,زبان درازی ہونے لگی. کچھ دن لمبی چپ چلتی اور باقی سارے دن دوبدو لڑائی ہوتی رہتی. وہ گھنٹوں گھر سے باہر اپنی مرضی کا وقت گزارتی تو حبیب احمد کی بے توجہی کا ملال جاتا.

اچانک زندگی نے پینترا ہی بدل لیا. روایتوں,حکایتوں اور دوڑتی بھاگتی مشینوں کو سٹاپ لگ گیا. ایسی رکاوٹ....ایسا ٹھہراؤ در آیا جو انسان کی سوچ,اندازے اور سمجھ سے بہت اوپر تھا تو انسان کا سمسانا,الجھنا,مضطرب ہونا لازم تھا. وقت نے مٹھی بند کر لی. زندگی کو اسٹیٹس کا ناچ نچانے والے خود ایک انوکھی,ان چاہی تال پہ تھرکنے لگے. بے بسی انتہاؤں پہ تھی. ساری دنیا ہی ایک دم بے بس ہوگئی. "وبا" کی مرضی کے مطابق روز وشب کی ترتیب بنائی جانے لگی. گھر آباد اور گلیاں,بازار ویران ہونے لگے. ہر طرف سناٹا اور پابندیاں تھیں

گھر سے باہر اور چور جگہوں میں پنپنے والے سچے جھوٹے رشتے دم توڑنے لگے. اب گھروں میں قید سچے رشتوں میں ملاوٹ کرنے والے لوگ مرغِ بسمل کیطرح تڑپ رہے تھے. وباز وروں پہ تھی اسے سائنس کی کوئی چال, گھناؤنی سازش کہا جاتا تو کبھی مذہب سے دوری کو وجہ گردان کر خوف وہراس پھیلایا جاتا. راتوں میں گھروں کی چھتوں پہ بے وقت اذانیں دے کر سمجھا جاتا کہ یوں روٹھے ہوئے رب کو منالیں گے. اور وہ مان ہی جائے گا. پھر سے کن کہہ کے دنیا کو جِلا بخشے گا.

وقت وبا کے چنگل میں جکڑا اڑیل پن دکھا رہا تھا. انسانوں کو دھڑا دھڑ موت نگل رہی تھی اور قبریں اگلنے لگی تھیں. قبرستانوں کی اراضی ناکافی لگنے لگی تو لاشیں دریابرد ہونے لگیں. ہر طرف سناٹا تھا. موت کا سناٹا. کسی صورت بھی کاروبارِ حیات ڈگر پہ نہیں آرہے تھے. بے نتھے بیل جیسے خود سر مرد.. مرضی کی مالک ہو چکی بیویوں کے سر پر سوار تھے. بیویاں بھی نوکروں کو فارغ کر کے خود ہر کام کرنے پہ مجبور تھیں. ہر کوئی دوسرے کی نحوست سے بچنا چاہتا تھا. ایسے میں سب سے بڑا اور صبر آزما کام دن رات کے تمام گھنٹے بیویوں اور شوہروں کے مزاج کے مطابق چلنا تھا. بے شک راستے کھوٹے ہو چکے ہوں. دل نفرتوں سے اور منافقتوں سے بھر چکے ہوں. جذبے سرد بھی پڑ چکے ہوں بستر گرم رکھنا تھے.

بہت ہی کم لوگ تھے جنہوں نے فاصلہ رکھنے کے دنوں میں فاصلے مٹائے ہوں اور محبت کی راہگزر پہ چل پڑے ہوں. ورنہ طلاقوں کی شرح زیادہ ہو رہی تھی. آن لائن موٹیویٹرز اور ماہرِ نفسیات رواج پا رہے تھے. اسی اتار چڑھاؤ میں جذبوں سے ملمعے اتر رہے تھے. شوہر جو مہینہ بھر وضعدار بنے پھرتے رہتے تھے اب روز آپے سے باہر ہو جاتے.

ایسے میں شفق کا حیران ہونا بنتا ہی تھا نا صرف حبیب صاحب کے محبت سے لبریز لہجے میں بلانے پہ حیران ہوتی تھی وہ تو خود پر بھی حیران تھی. آج شام سے ہی مزاج میں ملاحت اتر رہی تھی. وہ مسکرا مسکرا کر سج سنور رہی تھی. چال میں بھی مستی در آئی تھی. سمٹتے ہوئے فاصلے اسے خوش فہمیاں دے رہے تھے. اس نے بخوشی سمیٹ ڈالے. ایسے ہی بہکتے پل میں حبیب احمد نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ کسی معمول کی طرح چلتی گئی. مقابل کرم پہ خوش ضرور تھا لیکن بار بار چونک رہا تھا. انداز, ادائیں اسے زیر بار کیے دے رہی تھیں. بیوی سے اکثر مرد ایسی محبت کی توقع نہیں کر رہے ہوتے. شریف بنے رہتے ہیں تاکہ بیوی بھی حد میں اور اوقات میں رہے. لیکن اب اس وبا نے گھروں تک ہی محدود کر دیا تھا تو رشتے ہی غنیمت لگ رہے تھے سارے چھل کپٹ دم توڑ چکے تھے. اصل چہرے چھپانے مشکل ہو رہے تھے.

کمرے کے مہکتے سناٹے میں ہلکی سی روشنی تھی جیسے دانستہ بے خبری ہو. کوئی جان بوجھ کے انجان بن رہا ہو. خوشی سے دھوکہ کھانا چاہتا ہو.

جب جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا تو حبیب احمد نے شفق کو دیوانگی سے چومتے ہوئے سرگوشی کی.

"بہت مس کر رہا تھا میری جان.. شیلا.... شیلا مائی ڈیئر...... شیلاااااااا..... لو یو ڈیئر... سسکاری بھری آواز نے شفق کے حواس بحال کر دیئے. وہ پوری طرح بیدار ہو گئ.

شفق نے آواز کی ٹوٹتی, لرزتی, نشے میں ڈوبی بازگشت پہ خود کو گہرے سمندر میں گرتا محسوس کیا. ماحول کا سارا سحر ایک چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا.. لفظوں اور لہجوں کا شور حواس مختل کرنے لگا. لیکن موت جیسی چپ بھی تھی. سو بھید کھولتی زہریلی چپ بدن نیلے کر رہی تھی.... وہ ایک طرف گرتی ہوئی دوہرے درد سے بے حال تھی... بالکنی سے جھانکتی ہلکی سی روشنی میں اس اپنے... لیکن یکسر اجنبی شخص کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی.

"میں شیلا نہیں ہوں." وہ پوری قوت سے چلائی.

" سمجھے آپ ـ ـ ـ میں شیلا نہیں ہوں" وہ بندھن کے بوجھ تلے دبی بری طرح کراہی.

کروناکارن

شاکر انور

اسکی آنکھوں کے نیچے دھوپ کی پتلی سی لکیر بچھی تھی۔ دوپہر کے سناٹے میں دروازے پر اسے دیکھ کر میں حیران ہوا، تھوڑی سی الجھن، کچھ کچھ خوف اور شاید مدھم سنہری امیدوں کو اپنے پیروں میں لپیٹے وہ جھجھکتی ہوئی مسکرائی۔

اپ نے پہچانا نہیں میں مسز مالتی ملہوترہ، کناٹ پلیس میں ہم ملے تھے کرونا سے پہلے۔ اب تو پہچانا

اندر آجائیں، کیسے آنا ہوا، صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر میں نے پوچھا

۔ میری مسکراہٹ کے آدھے حصے نے اسکی مسکراہٹ کو مکمل۔ کر دیا

یہ چٹھی ہے، ملہوترہ نے دی ہے۔ صوفے پر تنگ لباس میں بھرے بدن کو سمیٹتے ہوئے وہ بیٹھ گئ۔ مجھے لگا وہ مٹھی میں ہوا کو بند کر رہی ہو، میں اس سے کچھ پرے بیٹھ کر چٹھی پڑھنے لگا دل تو چاہا کہ قریب ہی بیٹھوں لیکن اندیشہ ہوا، قربت کی جلدی کہیں دوری میں نہ بدل۔ جائے

پیارے سنیل جی! آشا ہے سب کشل ہو گا۔ کرونا کارن مین آجکل بہت پریشان ہوں۔ ورکشاپ بند پڑا ہے۔ اپ کی گاڑی کے ڈینٹ پینٹ کا کام بھی نہیں کر سکا اب تک

مجھے ابھی 5 ہزار کی بہت اوشکتا ہے۔ آپ کی گاڑی کے کام کر دوں گا تو اس سے کاٹ لیجئے گا۔ یقین ہے نراش نہیں کرینگے

آپ کا سچا متر ملہوترہ

وہ سر جھکائے قالین پر پاوں کے انگوٹھے رگڑتی رہی میں اسکی جانب نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا ہو گا کہ اسے ہی دیکھ رہا ہوں وہ بھی مجھے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے ہی دیکھ رہی ہو گی۔ کچھ نظریں بغیر دیکھے ہی سب کچھ دیکھ لیتی ہیں

۔ کمرے میں جاکر میں نے ڈھائی ہزار اسی لفافے میں رکھ کر مالتی کو دیا

وہ کچھ شرمندہ سی آنکھیں ملائے بنا دھنواد کہتی چلی گئی اسکے اندر شاید بے بس جھنجھلاہٹ کی کسک تھی۔ اسکے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی شاید بے بسی کا وہ احساس جو اسے پسپا کر رہی تھی

میں اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اسے ضرور محسوس ہوا ہو گا کہ میری انگارے جیسی نظریں اسے جلا رہی ہونگی

میں واپس کمرے میں آیا۔ کھڑکی سے باہر دوپہر کا سناٹا کرونا کو مستحکم i9 کر رہا تھا۔ راستے سنسان، گلیاں خاموش، صرف ہوا کی تیز چبھتی ہوئی اواز گھوم رہی تھی۔ آس پاس ہوا اور آسمان سڑکیں گلیاں اور درخت اور پرندے اور دھوپ کی تیز شرارے کے علاوہ کچھ بھی نہیں

.مجھے گلابی ستمبر کی وہ شام یاد آگئی جب کناٹ پلیس میں چلتے ہوئے اچانک ملہوترہ نے آواز لگائی اور پھر گلے لگ گیا۔ اسکے ساتھ اسکی نئی نویلی بیوی مالتی بھی تھی جینز کی پینٹ اور ہاف سلیوز کی سفید شرٹ میں ملبوس۔ یہ میری پتنی مالتی ہے لیکن مین اسے مالٹا کہتا ہوں اس نے آنکھ مار کر کہا سمجھ گئے ہوگے کیوں؟. وہ اپنے اندر ساری سنہری شام کی سندرتا سمیٹے سامنے سمٹی سی دونوں گھٹنوں کو جوڑے اپنا چہرہ اس پر ٹکائے نیچے دیکھ رہی تھی

یہ میرا دوست سنیل پانڈے، بہت پیارا انسان ہے، سب کی سہایتا کرنے والا لیکن اب تک کنوارہ ہے

وہ ہنسا اور میرے کندھے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کوئی کری بھی نہیں پھنسائی دلی میں اب تک ۔اس کی ہنسی میں بے تکلفی سے زیادہ بے ساختگی تھی

اچھا وہ بے باکی سے ہنسی۔ کہیں؟ کچھ؟ کہتے ہوئے اس نے

ملہوترہ کو دیکھا۔ پھر شوخ نظروں سے مجھے۔ میں بھی جھنیپ مٹانے کو ہنس پڑا حالانکہ میری ہنسی کا کوئی جواز نہ تھا آچانک ہی مجھے لگا کہ میں بیچ بازار برہنہ ہو گیا ہوں

ارے نہیں مالتی ایسا نہیں بس، میرا یار تھوڑا شرمیلا سا ہے اسکے ہاتھوں کا دباو میرے کاندھے پر میرے احساس سے زیادہ تھا

ہم تینوں جنپتھ مارکیٹ میں دیر تک ونڈو شاپنگ کرتے رہے پھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر موسیقی سنتے ہوئے کولڈ کافی کی چسکیاں لیتے رہے

مالتی تمہی معلوم ہے میرا دوست لیکھک ہے بہت اچھی کہانیاں لکھتا ہے

واو وہ خوشی سے بولی۔ لیکھک لوگ تو بڑے مہان ہوتے ہیں اور خود کو سمجھتے بھی ہیں

لیکن ایک مسئلہ ہے ان کے ساتھ

وہ کیا، ملہوترہ نے پوچھا

انکی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے کسی کو اس میں آنے نہیں دیتے لیکن دوسروں کی دنیا میں خاموشی سے اتر جاتے ہیں۔

ٹھیک کہ رہی ہوں نا سنیل بابو، وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی

تم کہ رہی ہو تو ٹھیک ہی کہ رہی ہو گی۔ میں نے اسکی باتوں کو ٹال دیا۔

لیکن مجھے معلوم ہے کہ لکھنا بہت مشکل کام ہے ہر کوئی نہیں لکھ سکتا

میں نے بھی کئی بار لکھنا چاہا لیکن نہیں لکھ سکی۔ آپ کیسے لکھتے ہیں۔

قلم سے۔ میں نے سر جھکائے دھیرے سے کہا

ملہوترہ بے ساختہ ہنس دیا اسکی ہنسی اتنی تیز تھی کہ لوگ پلٹ کر دیکھنے لگے۔مالتی کچھ شرمندہ سی ہو گئ

یار اپنی بھرجائی کو کچھ کتاب شتاب پڑھنے دے دیا کر،خوش ہو جائے گی۔ یہ خوش ہو گی تو میں خوش ہو جاوں گا اس نے مالتی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا

ملہوترہ جیسے کئ لوگوں سے میری دوستی تھی۔ فروٹ چاٹ والے شکور چاچا جو کبھی مجھ سے چاٹ کے پیسے نہیں لیتا،پترول۔ پمپ کے اروند جو میری گاڑی میں پورا پٹرول بھرتا،اور شمبھو بہاری جو میرے ہی گاوں کا تھا ملائ والی چائے پلاتا۔ میں بھی اکثر اپنے دوستوں کے کام آجاتا پیسوں سے، لیکن میری عادت تھی ہمیشہ انکی مانگ سے آدھے پیسے دیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ قرض دئے پیسے واپس نہیں ملتے اسی لئے آدھے دیکر خوش ہو جاتا کہ ادھے بچالئے

ایک دوپہر دھوپ اوڑھے وہ بھر آگئ ۔اس بار اس کے قدموں میں کوئ گرداب نہیں تھا۔وہ بے تکلفی سے مجھ سے پتلی سی دوری پر بیٹھ گئ پھر ایک خط جینز کی پچھلی پاکٹ سے نکال کر دیا

سنیل۔بابو! حالات تو اب زیادہ برے ہو گئے، آپکو تو سب پتہ ہے۔اپ ہی تو میرے دوست ہیں جن کے آگے منہ کھول سکتا ہون ۔مالتی تو آپکی بڑی پرشنسا کرتی ہے۔ کہتی ہے سنیل بابو تو دھرتی پر بھگوان ہیں۔ آج۔مجھے دو ہزار چاہئے بہت ضرورت ہے امی ہے نراش نہین کرینگے اپکا دوست ملہوترہ

۔میں نے ایک ہزار روپے اسی لفافے مین رکھ کر اسے دئے اس نے نظرین جھکائے لفافہ لیا

اپکا فلیٹ تو بہت ہوادار ہے شاید ویسٹ اوپن ہے وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔بہت اچھا لگتا ہے یہاں پر۔میرے گھر تو بہت گھٹن ہے۔ تازہ ہوا کو ترس گئ ہوں۔ آپ مجھے کچھ ہوا ادھار دینگے۔۔۔وہ ہنسی۔

ضرور کیوں نہیں لیکن

لیکن کیا۔ادھار چکادونگی جب اپ کہیں گے وہ مسکان بھری نظروں سے دیکھتی ہوئ چلی گئ وہ چلی گئ

خود کو مجھ پر چھوڑ کر،حالانکہ وہ رک سکتی تھی،شاید رکنا بھی چاہتی تھی مگر رکی نہین، میں بھی اسے روک سکتا تھا،روکنا بھی چاہ رہا تھا مگر روکا نہیں اور وہ چلی گئ

وہ بادلوں بھری دوپہر تھی۔میں نے کئ گھنٹوں کے ورک فروم ہوم سے اوب کر اپنے بدن کو ایک انگڑائی سے اوپر کھینچا،ہاتھوں کو اوہر نیچے کر کے کرسی سے کھڑا ہو کر باہر زرد پتوں کو تیز ہوا کے بگولوں میں بے بسی سے چکر کھاتا دیکھتا رہا۔ ہوا نے بگولوں کو دیوار سے لگا رکھا تھا۔اندر کی ہوا کو دھکے دیکر باہر نکالنے میں کوشاں تھی

سڑک پر سناٹا تھا ایک بیکراں سناٹا، موت جیسا، کبھی کبھی پولیس وین یا ایمبولینس تیزی سے گزرتی کہ اچانک گھنٹی بجی۔ دروازے پر کوئی پورا جسم ڈھانپے ،ماسک لگائے کھڑا تھا

پہچانا نہیں وہ آنکھوں سے مسکرا رہی تھی

پھول کو کوئی بھی نام دو خوش بو سے پہچانا جاتا ہے مالتی۔

اندر آجاو۔ مین نے پورا دروازہ کھول دیا، ادھا بھی کھول سکتا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی سی لگی۔ جلدی سے ایک پرچی تھمادی

سنیل بابو! بہت دبدھا مین ہوں اپ ہی میرے متر ہیں جس سے کچھ کہ سکتا ہوں ابھی مجھے 1000 روپے کی بہت ایمرجنسی ہو گئ ہے۔ نراش نہیں کرینگے اور ایک بنتی ہے کہ پیسے پورے دینگے اپکا کیول دوست ملہوترہ

مین نے پرس سے پیسے نکال کر اسی لفافے مین ڈال کر مالتی کو بڑھایا۔ لفافہ لیتے ہوئے اس نے ایک چھن کیلئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر چھوڑ دیا۔ اسکے نرم گلابی ہتھیلی نے مجھے ایک نڈر ساخیال دیا۔ اسے اپنی طرف کھینچ لوں ، مین کھینچنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا وہ ریشمی مسکراہٹ بکھیرے چلی گئی میرے ہاتھ مین صرف اسکی گرماہٹ رہ گئی ،، مجھے اپنی رگوں میں بے بسی کی لہریں امنڈتی محسوس ہوئی ، میں نے جھک کر گملے میں کھلے گلاب کو سونگھا، جب زندگی میں خوشبو نہیں تو گلاب سے کیا لینا۔ میں نے گلاب توڑا اور پھینک دیا کچھ دیر بعد ہی

پھر گھنٹی بجی اور مالتی دروازے سے ہی ایک پرچی تھما کر چلی گئ

سنیل بابو! آپ سے ایسی آشا ہر گز نہین تھی ، آپ اتنے کمینے ہونگے ، مین نے جب بھی آپ سے پیسے مانگے آپ نے ادھے دیکر ٹرخا دیا اور آج تو اپ نے حد ہی کر دی میں نے 1000 مانگا اور آپ نے 500 روپے دئے۔ اپ نے میری پتنی کی جوانی اور خوبصورتی کی قیمت پانچ سو روپے لگائی۔ شرم انی چاہئے آپکو۔ مجھے گھرنا اتی ہے اپکو دوست کہتے ہوئے۔

مالتی چلی گئی اور میں باہر اسی بگولے کو ڈھونڈ تا رہا جو اب شاید میرے دل مین چکر لگا رہا تھا۔

مقناطیس

ڈاکٹر جمیل حیات

"اگر آپ خود کوشش نہیں کریں گے تو اِس مصیبت سے آپ کو کوئی اور نہیں نکالے گا۔"

بزرگ کافی دیر سے اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ مانا کہ بہت مشکل ہے لیکن آپ پڑھے لکھے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ اِس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

وہ ہمہ تن گوش تھا۔ "بجا فرمایا حضرت آپ نے۔" بڑی دیر کے بعد بالآخر اُس نے زبان کھولی۔ "پھر بھی آپ اللہ والے ہیں۔ دعا بھی تو تقدیر بدلتی ہے۔" بزرگ مسکرائے، اُن کا دلآویز تبسم مایوس اور ناامید لوگوں کے لیے زندگی کی علامت تھا تاہم وہ اِس وقت بہت بکھرا ہوا، بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا اُس کی نظر اُن پر تو تھی مگر ذہن کہیں اور تھا۔ "میاں تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ اللہ اُس وقت تک کسی قوم یا فرد کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔"

اُس کی نگاہوں میں دنیا جہاں کا کرب تھا۔ "اِس کا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں۔" اُنہوں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب یہ صرف آپ پر منحصر ہے۔ آپ کوشش تو کریں، مالک کرم کرے گا۔"

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب وہ بزرگ سے اِجازت لے کر نکلا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ اپنے خیالوں میں گم تھا، جب اچانک ہی کسی گاڑی کے زور سے بریک لگانے کی آواز نے اُسے چونکا دیا:

"او بھائی! اگر خودکشی کا اِتنا ہی شوق ہے تو کہیں اور جا کر مرو۔"

ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو ایک پک اپ کھڑی تھی اور تیس بتیس سالہ آدمی اُسے گھور رہا تھا۔ اُس نے معذرت کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سٹاپ پر پہنچا گاڑی کھڑی تھی وہ بیٹھ گیا اور اس دن کی یاد اس کے ذہن و دل میں خوف کے سانپ کی صورت کلبلانے لگی جس سے پہلے وہ اپنے حال میں مست ایک خوش فکر آدمی تھا۔

سلمان خورشید نجی بنک میں منیجر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ وہ چار بھائی تھے اور چاروں شادی شُدہ تھے۔ اُس سے بڑا ارسلان خورشید، جب کہ چھوٹے نعمان خورشید اور ارمان خورشید۔ تینوں حساس ادارے میں ملازم تھے، جب کہ ایک بہن تھی عدیلہ، وہ بھی شادی شُدہ تھی۔ زندگی پُر سکون گزر رہی تھی۔ اُن کے والد کا اِنتقال ہو چکا تھا، والدہ چھوٹے بھائی کے ساتھ رہائش پذیر تھی جب کہ بڑا بھائی ارسلان علیحدہ گھر میں رہتا تھا۔ اور وہ تینوں ایک حویلی میں، تاہم سب کے پورشن علیحدہ تھے۔

سلمان ٹھنڈے مزاج کا حامل پستہ قد، فربہ جسم اور قبول صورت آدمی تھا۔ تاہم اُس کے تینوں بھائی خوش شکل اور دراز قد تھے۔ وہ اپنے بابا پر گیا تھا جب کہ بھائی اور بہن ماں پر۔ گزشتہ تین دن سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ نعمان کا رویّہ ٹھیک نہیں۔ شام کا وقت تھا، نعمان کافی دیر سے ماں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اُٹھا تو سلمان ماں کے پاس چلا گیا۔

"کیا بات ہے اماں؟"

"بیٹا! تم اپنی بیوی کو سمجھاؤ کہ وہ چھت پر نہ جایا کرے۔"

یہ حکم اُس کے لیے بہت حیران کُن تھا۔

"کیا مطلب؟" اُسے سمجھ نہیں آئی۔

"نعمان بہت غصے میں ہے۔ اُسے بھابی کا چھت پہ جانا اور باہر جانا پسند نہیں۔"

"ماں جی آپ کو پتہ ہے کہ چھت پہ فصیل پھری ہوئی ہے اور اوپر سے کوئی بندہ بھی اِدھر نہیں جھانک سکتا۔ چھت پہ صرف اُسی وقت جاتی ہے جب کپڑے سُکھانے کے لیے اوپر تار پہ لٹکانے ہوں اور باہر وہ عظمیٰ کو سکول لانے لیجانے کے لیے جاتی ہے۔ آپ جانتی ہے کہ وہ بہت اچھی عورت ہے۔"

وہ نرم لہجے میں ماں سے پھر مخاطب ہوا:

"اُسے آج کیوں تکلیف ہو رہی ہے؟ ہماری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں، اور آج تک میں نے عالیہ میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ مجھے اُس پر مکمل اعتبار ہے۔"

اتنے میں نعمان بھی آ گیا اور غصے میں اُس نے سلمان کو مخاطب کیا:

"اپنی بیوی کو سمجھاؤ! ورنہ میں اُسے سیدھا کر دوں گا۔"

اُسے بھی غصہ آ گیا: "یار ہوا کیا ہے؟ میری بیوی ہے میں اِسے جانتا ہوں۔ تمھارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو میرے ساتھ بات کرو۔"

اِتنی دیر میں عالیہ بھی وہاں آ گئی۔ نعمان نے دیر نہیں لگائی۔ اور عالیہ کو لات رسید کر دی، درمیان میں سلمان آ گیا۔ نعمان نے اسے بھی لات رسید کر دی اور پھر اُس کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ ماں نے شور مچایا۔ سلمان لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا۔ اِسی وجہ سے اُسے کافی مار پڑی، دوسرا اُس نے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ اُس کی معصوم بیٹی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ بیچاری رونے لگی۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ نعمان غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے عالیہ کو بے نقط سنائیں۔

"میں بتا رہا ہوں تمھیں اور تمھارے شوہر کو نہیں چھوڑوں گا۔ تباہ کر دوں گا تمھیں۔"

عالیہ شوہر کو پٹتے دیکھتی رہی تھی اور روتی رہی تھی۔ وہ بیچاری عورت ذات تھی بد دعائیں دے سکتی تھی، وہ کُھل کر دے رہی تھی۔

وہ نومبر کی ایک سرد اور خاموش رات تھی۔ کمرے میں ۔ تاہم وقفے وقفے سے سات سالہ عظمیٰ کی سسکیوں کی آوازیں آجاتی تھیں۔

"کہا تھا نا کہ یہاں سے نِکلو۔ لیکن تمھیں تو ماں سے محبت ہے۔ جب تک ماں ہے اِس گھر سے نہیں جاؤں گا۔ دیکھ لیا، ماں اِنہی لوگوں کے ساتھ ہے۔"

عالیہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

"یار ماں بے بس ہے۔"

"بے بس نہیں ہے، اندر سے خوش ہے ورنہ اُسے روک نہیں سکتی تھی کہ بڑا بھائی ہے۔ بڑی بھابی تو ماں کے برابر ہوتی ہے اور یہ مجھ پر اِلزام لگا رہا ہے، اور وہ بھی بالکل بے بنیاد۔"

"اچھا نا یار! اب چُپ بھی کر جاؤ۔"

"یہ سارا کیا دھرا اُس کی بیوی کا ہے، وہ چاہتی ہے کہ ہم نکلیں اور وہ ہماری جگہ پہ قابض ہو جائیں۔"

وہ ساری رات جاگتے رہے، اُس رات اُنہوں نے کھانا بھی نہ کھایا۔ سات سالہ عظمیٰ بہت حساس تھی، اِصرار کے باوجود اُس نے بھی کھانا نہ کھایا۔

یہ اگلے دن کی بات ہے، عالیہ کھانا بنا رہی تھی کہ نعمان کی بیوی، فروہ چولہے کے پاس سے گزری۔ سلمان نے دیکھ لیا۔ وہ پہلا دن تھا جب اُس کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ کہیں اُس نے کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔ اُس نے اِس شک کا اِظہار عالیہ سے کیا تو اُس نے کہا کہ وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی، تم پریشان نہ ہو۔ تاہم عالیہ کے بے حد اِصرار اور منت کے باوجود اُس نے کھانا نہیں کھایا۔ پھر یہ معمول بن گیا، عین کھانے کے وقت یا پانی بھرتے وقت فروہ وہاں سے گزرتی اور پھر عالیہ اور سلمان کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اُس نے ماں سے شکایت کی تو ماں نے بھی فروہ کی حمایت کی کہ وہ اپنے گھر میں ہوتی ہے، تمھاری غلط فہمی ہے۔

سلمان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ لوگ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ پھر ایک اور واقعہ ہوا، وہ قبرستان میں گیا ہوا تھا، بابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھتے ہوئے اُس کے پاؤں کے بالکل پاس سے سانپ گزر گیا۔ وہ گھبرایا ہوا گھر واپس آیا تو عالیہ اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی:

"سلی! کیا ہوا تمھیں؟" اُس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ "وہ۔۔۔ وہ۔۔ سانپ۔۔۔ وہ میرے پاس سے۔۔۔ پاؤں کے بالکل پاس سے گزرا ہے۔ پتہ نہیں اُس نے کاٹا ہے یا نہیں۔ لیکن شاید کاٹا ہے۔ شاید نہیں۔"

وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ عالیہ اُس کے پاس بیٹھ گئی:

''مطمئن ہو جاؤ! نہیں کاٹا۔ اگر کاٹا ہوتا تو تم اِس وقت یوں کھڑے ہو کر باتیں نہ کر رہے ہوتے۔''
عالیہ جانتی تھی کہ اب وہ پانی نہیں پیئے گا، اُس نے سُن رکھا تھا کہ سانپ کاٹ لے تو پانی نہیں پینا چاہیے کیونکہ پانی پینے کی صورت میں موت یقینی ہے۔ عالیہ کی ہزار منتوں کے باوجود اُس نے پانی نہیں پیا۔ وہ ساری رات پیاس سے تڑپتا رہا۔ پھر یہ بھی معمول بن گیا زہر اُس کے ذہن کے کونے کھدرے میں بیٹھ گیا۔ راستے میں چلتے چلتے وہ کالے رنگ کا دھاگہ دیکھتا یا بال دیکھ لیتا تو اُن کو پکڑ کر دو حصوں میں کاٹ لیتا، تب اُس کو یقین ہوتا کہ سانپ نہیں ہے۔

''یار! گرمی بہت شدید ہے اور تم نے بوٹ اور جرابیں پہن رکھی ہیں۔ دماغ کو گرمی پہنچے گی۔ چپل پہنا کرو۔''
ارمان نے سلمان کو بوٹ پہنے دیکھا تو کہا۔
گھر میں سب کو پتہ چل چکا تھا کہ سلمان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ اِس لیے اُس نے اُسے سمجھایا۔
''اور بھابی کہہ رہی ہے کہ تم دو دو تین تین دِن پانی نہیں پیتے۔ میرے بھائی! اِس طرح پانی کی کمی ہو جائے گی اور کئی بیماریاں جنم لیں گی۔''
تھوڑے توقف سے اُس نے پھر کہا:
''اور ہاں! جس نے ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اِس لیے اپنے آپ کو یوں برباد نہ کرو، پڑھے لکھے ہو کچھ خیال کرو۔''
وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ اُسے کیسے بتاتا کہ وہ تو اِس مصیبت سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اِس پر اب اُس کا اِختیار نہیں ہے۔
اُس دن عالیہ اپنی امی کے گھر گئی ہوئی تھی، سلمان نے پانی بھرا اور پھر اُسے کہیں جانا پڑ گیا۔ اُس نے کمرے کو تالہ لگایا اور چلا گیا۔ واپس آیا تو اُسے فکر لاحق ہو گئی کہ پتا نہیں کسی نے پانی میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔ اُسے اِحساس تھا کہ اُس کی قوتِ ارادی بہت کمزور تھی۔ چنانچہ وہ قابو نہ پا سکا اور سارا دن بھوکا پیاسا بیٹھا رہا۔ ماں نے اُسے کھانے پر بلایا تو اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اُسے بھوک نہیں ہے۔ شام کو وہ دکان سے سیب لے آیا۔ ماں کو پھر انکار کیا اور رات کو سیب کھا کر سو رہا۔ عالیہ تین دن بعد گھر آئی تو سلمان کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔
''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟'' وہ چلائی۔
امی بھی رونے لگ پڑی، اُنہوں نے عالیہ کو بتایا کہ اِس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ ''اب اِسے مجھ پر بھی اعتبار نہیں ہے۔'' عالیہ بیٹھ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کھانا پکایا تو سلمان نے کھایا۔
رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو عالیہ نے اُس سے پوچھ لیا:

''تم صبح گھر سے ناشتہ کرنے کے بعد جب بنک جاتے ہو تو وہاں سے پانی کیوں نہیں پیتے؟''

''یار! میری چپڑاسی سے تلخ کلامی ہو گئی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اُس سے پانی مانگوں تو کہیں وہ پانی میں کچھ ملا نہ دے۔''

''تم پاگل ہوتے جا رہے ہو اور مجھے بھی پاگل کر دو گے۔''

''اپنے اوپر رحم کرو اور نہیں تو کچھ عظمیٰ کا ہی خیال کر لو۔ اُس کے ذہن پر منفی اثرات پڑیں گے۔ تم کھانے میں کیڑے نکالتے ہو، میں تین تین بار کولر کو کنگھالتی ہوں پھر بھی تم پانی نہیں پیتے۔ کئی بار تم گلاس کو دھوتے ہو۔''

عالیہ اُسے کہہ رہی تھی اور وہ ازل کا بدقسمت آنسو بہا رہا تھا اپنی بے بسی پر۔

''دیکھو تم آٹھ سے دس گھنٹے بنک میں ہوتے ہو، اور پانی تک نہیں پیتے۔ تمھارے جسم سے پانی ختم ہو جائے گا۔ بولو! پھر کیا کرو گے تم، کون سنبھالے گا تمھیں؟''

''میں کیا کروں عالیہ! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ ہوٹل سے میں نے کھانا کھانا چھوڑ دیا، میرے ذہن میں ایک ہی ڈر ہے کہ کوئی مجھے زہر نہ دے دے۔ میں نے دوستوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ رشتہ داروں کے گھروں میں جانا چھوڑ دیا۔ سب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں اگر کہیں جاتا بھی ہوں تو اگلا مجھے جتنا مرضی کہے میں اُس سے نہیں کھاتا، میں کیا کروں؟''

حقیقت بھی یہی تھی۔ وہ اپنے گھر میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ صبح بنک جاتا، تو ایک کپ چائے اور آدھا پراٹھا۔۔۔ یہ اُس کا ناشتہ تھا۔ پھر پانچ بجے اُسے چھٹی ہوتی اور چھ بجے وہ گھر واپس آتا۔ اِس دوران وہ بھوکا پیاسا رہتا۔ چلتے چلتے وہ راستے میں کبھی ایک طرف تو کبھی دوسری طرف دیکھتا، مبادہ کہیں سے سانپ نہ نکل آئے۔ گھر آتا تو بیوی کی خیر نہ ہوتی:

''کھانا بناتے وقت ہانڈی کی طرف دیکھا تھا یا دوسری طرف دیکھتی رہی تھی؟''

وہ بیچاری اُسے سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکی تھی۔

اُنہی دنوں اسے ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی ملنے آ گیا۔ باتوں کے دوران سلمان کو یوں لگا جیسے اُس آدمی نے سلمان کے منہ میں کچھ ڈال دیا ہو، اُس کے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو گئی، بہت مشکل سے اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اُس نے پہلے تو حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کی، کافی دیر کی کوشش کے بعد بھی کچھ نہ نکلا۔ نکلتا بھی کیسے کہ صبح سے بھوکا پیاسا جو تھا۔ پھر کافی دیر کلّی کرتا رہا۔ اِس نئی مصیبت کے بعد اُس کا باہر رہنا عذاب ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے تو اسے اُلجھن سی ہوئی اور اُس نے حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی۔

جب عالیہ گھر پر نہ ہوتی تو صرف عدیلہ کا گھر تھا جہاں وہ جاتا اور کھانا کھاتا۔ اُس دن عدیلہ کی خیر نہ ہوتی، وہ روٹی ایسے کھاتا کہ ایک نوالہ کسی روٹی سے توڑتا اور ایک نوالہ کسی دوسری روٹی سے۔ اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اکنامکس میں ایم فِل کرنے والا یہ آدمی جو ایک بہت عمدہ اور اچھی ملازمت بھی کر رہا تھا اندر سے کتنا ٹُوٹا پھُوٹا تھا۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ انسان بہت اچھا اور بہت زیادہ کما سکتا ہے لیکن کھا اُتنا ہی سکتا ہے جتنا اُس کے نصیب میں ہے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ رزق اُس سے رُوٹھ گیا تھا۔

اُس کی حالت خراب ہوتی گئی، کھانا پینا کم ہوتا گیا۔ اب اُس کے سینے میں تکلیف ہونے لگی۔ اُسے گھر والے سمجھاتے، لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتا۔ اب تو نعمان بھی راضی ہو گیا تھا، وہ بھی اسے سمجھاتا لیکن اب اُسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ گھر میں اُس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ تاہم وہ وقت پر بنک پہنچ جاتا، اور وہی وقت اُس کے لیے عذاب ناک ہوتا۔ اُس کے تعلقات بالکل ختم ہو گئے تھے لے دے کے سفیر رہ گیا تھا وہ آتا رہتا تھا۔ حالانکہ اب سلمان اُس سے بھی دُور ہی رہتا تھا۔ اُس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں ہی بیٹھا تھا جب اچانک سفیر آ پہنچا:

"اچھا ہوا جو تم موجود ہو، سناؤ! کیا ہو رہا ہے۔ سفیر اُس کا بہت اچھا دوست تھا لیکن جب سے اُس کے ساتھ یہ مسئلہ بنا، سلمان نے اُس کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا کہ اگر اُس نے کھانے کا کہہ دیا تو کیا ہو گا؟"

"آج کھانا اکٹھا کھائیں گے۔"

وہی ہوا جس سے سلمان دامن بچاتا تھا، "نہیں یار! آج بہت کام ہے، میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ تمھارے لیے منگوا لیتا ہوں۔"

"او یارا! ہم نے کون سا باہر جا کے کھانا ہے جو تمھارا وقت ضائع ہو گا، یہیں منگوا لیتے ہیں۔"

سفیر نے گرمجوشی سے کہا۔ "بہت دن ہو گئے تم گھر پہ بھی نہیں آ رہے، خیریت ہے کہیں ناراض تو نہیں مجھ سے؟"

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں، کچھ مسائل ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد آؤں گا تمھاری طرف۔"

"اچھا تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ پرسوں میرا نکاح ہے۔ تم لوگوں نے آنا ہے۔ شادی تو بعد میں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے جناب! ضرور آئیں گے۔" سفیر کے جانے کے بعد وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ایک نئی مصیبت آ گئی، اب پھر کھانا نہ کھانے کا کوئی بہانہ سوچنا پڑے گا۔ اُس کے ساتھ یہ مسلسل ہو رہا تھا۔

بہن کے مسلسل اصرار پر وہ ماہرِ نفسیات کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر حسنین نے اُس کی بات بہت غور سے سُنی:

"برخوردار! یہ انسانی ذہن بھی بہت عجیب وغریب چیز ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں یہ موت کا خوف ہے۔ سانپ ہو یا زہر، یہ علامت ہے موت کی۔ اب موت تو اٹل ہے، آپ اِس خوف سے کہ کہیں سانپ نے نہ کاٹ لیا ہو دو دو دن تک پانی نہیں پیتے۔ اِس سے آپ کو کوئی دوسری بیماری لگ جائے گی اور آپ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ کیا ہو گیا۔"

"بحیثیت مسلمان یہ ہمارا ایمان ہونا چاہیے کہ موت برحق ہے۔ اِس لیے آپ مطمئن ہو جائیں۔ ویسے یہ ایک بیماری بھی ہے جس کو شیزوفرینیا بھی کہتے ہیں۔ اِس میں انسان وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔"

وہ وہاں سے بھی اُٹھ کر آ گیا۔

ایک دن ماں نے اُس سے کہا:

"بیٹا سلمان! نماز پڑھا کرو، تمھیں سکون ملے گا۔"

وہ نماز کے لیے کھڑا ہوا تو اُس کے ذہن میں سینکڑوں اندیشوں نے سر اُٹھایا، "اگر نماز پڑھتے وقت پاؤں پر کسی چیز نے کاٹ لیا تو۔۔۔"

اُس نے نماز توڑ دی۔۔۔ وہ بہت زیادہ ذہنی ٹُوٹ پھُوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔۔۔

وہ گھر میں ہوتا تو فرج کو تالہ لگا دیتا، پانی کی بوتلوں کو خود بھرتا۔ اُنہیں فرج میں رکھتا، فرج کو تالہ لگا دیتا لیکن جب پانی پینے کے لیے فرج سے بوتل نکالتا تو سوچ پہلے ہی سے اُس کے اندر موجود ہوتی: "جب بوتل میں پانی بھر کے رکھ رہے تھے، تو کہیں اُس وقت کسی نے اُس میں کچھ ملا نہ دیا ہو۔"

یہ سوچ آتے ہی وہ بوتل کو رکھ دیتا۔ ایک اور مسئلہ جو اُس کے ساتھ شروع ہو گیا تھا کہ وہ آدھا آدھا گھنٹہ صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا۔ پھر کافی دیر کُلّی کرتا رہتا۔ تب کہیں جا کے وہ مطمئن ہوتا اور پھر کھانا کھاتا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے اچانک اُچھل پڑتا اور پھر عالیہ کو کہتا کہ دیکھو! کہیں کسی چیز نے میری کمر پہ کاٹا تو نہیں ہے۔ وہ بیچاری بھی عذاب ناک زندگی گزار رہی تھی لیکن صابر شاکر تھی۔ عالیہ نے کوئی درگاہ نہیں چھوڑی جہاں اُس نے سلمان کے لیے دعا نہ کی ہو۔ لیکن شاید کہیں کمی تھی جو دعا پُوری نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ساری ساری رات جاگتا رہتا، رات بھر وہ خدا سے باتیں کرتا رہتا۔ "یا اللہ! مجھے اِس مصیبت سے نکال۔۔"

لگتا تھا کہ خدا بھی اُس سے ناراض تھا۔

وقت گزرتا رہا، سردیوں میں تو وہ کمرے میں سوتا رہا اِس لیے رات کو نیند آ جاتی تھی لیکن جب گرمیاں آئیں تو اُس کے لیے ایک اور عذاب تیار تھا۔ چونکہ صحن ایک تھا اِس لیے سب گھر والے رات کو باہر صحن میں سوتے تھے۔ پہلی رات کو ہی اُسے اِس پریشانی نے گھیر لیا کہ اگر رات کو کسی نے اُسے سوتے میں کچھ دے دیا تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جاگتا رہا، نیند سے لڑتا رہا۔۔۔ جب آنکھ لگتی

نادیدہ خوف اُسے جگادیتا۔ کب آنکھ لگی اور وہ سو گیا اُسے پتہ نہ چلا۔ پھر یہی ہوتا رہا جب تک وہ جاگ سکتا، جاگتا رہتا اور تھوک پھینکتا رہتا۔

ایک دن اُس کے جی میں آئی تو وہ جامع مسجد کے خطیب حضرت مولانا عبدالرشید فاروقی کے پاس چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں مولانا زمینی بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ بستر کے ساتھ الماری تھی جو کہ کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی قالین پر اُن کے پاس بیٹھ گیا، مولانا نابینا تھے۔

سلمان نے اُنہیں سلام کیا تو اُنہوں نے گرمجوشی سے جواب دیا۔ جب اُس نے بات شروع کی تو وہ غور سے سننے لگے۔ اُنہوں نے بات سننے کے بعد اُسے مخاطب کیا: ''سلمان میاں! بندہ دشمن کو بھی تنگ نہیں کرتا، آپ سجنوں کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟''

سلمان حیران ہو گیا، چند لمحے تو اُسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ مولانا کا اشارہ کس طرف ہے۔ پھر جب بات سمجھ آئی تو وہ گنگ رہ گیا۔ مولانا نے اُسی شیریں لہجے میں بات جاری رکھی: ''ایسا کرو کولر میں سے ایک گلاس پانی مجھے پلاؤ۔'' سلمان نے پانی پلایا، وہ پھر بولے: ''میاں! اب ایک گلاس خود بھی پیو اور ہاں پریشان مت ہونا۔ میں تو گھڑے کا پانی پیتا ہوں پر مجھے پتا تھا کہ آج تم آؤ گے اِس لیے کولر رکھوادیا تھا اور فقیر کے پاس سے تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، پانی پی لو۔''

وہ دو گھنٹے وہاں بیٹھا رہا۔ مولانا نے اُسے تفصیل سے سمجھایا کہ یہ رب کی طرف سے آزمائش ہے۔ اُسے گھبرانا نہیں چاہیے، وہ جی بھر کر پانی پیے۔ جب وہ وہاں سے اُٹھا تو اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ مولانا کی تمام باتوں پر عمل کرے گا۔

گاڑی کے ہارن نے اُسے ماضی سے حال کی طرف لوٹا دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تھا، ابھی صرف چھ سواریاں بیٹھی تھیں جب کہ گنجائش اٹھارہ کی تھی۔ وہ پھر ماضی میں گم ہو گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر سمیر علوی کے گھر میں بیٹھا وہ سوچ رہا تھا کہ سر کو کس طرح کہے کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ لیکن سر کی عادت بھی اسے پتا تھی۔ اُس نے سوچا کہ یہاں تو فرار ممکن نہیں، چلو کھانا کھالیتے ہیں اور یہاں سے نکلتے ہی قے کر دیں گے۔ پروفیسر صاحب، جو کہ اُس کے اُستاد تھے اُس کی ایک ایک حرکت کو دیکھتے رہے۔ سر کی بیٹی پانی لائی تو بوتل کے ساتھ دو گلاس تھے لیکن سلمان نے پانی اُسی گلاس سے پیا جس سے سر نے پانی پیا تھا۔ پھر جب کھانا آیا تو اُس نے سر کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھایا، حالانکہ دوسری پلیٹ بھی موجود تھی۔ جب سر نے چائے کا کہا تو اُس نے انکار کر دیا کہ میں چائے نہیں پیتا۔ اُس وقت تو سر خاموش رہے لیکن جب دو دن بعد اُسے سفیر کے ساتھ دوبارہ سر کے گھر جانا پڑ گیا تو سر نے اُسے اور سفیر دونوں کو گالیوں سے نوازا، اُن کی گالیوں میں بھی محبت تھی۔ وہاں جب اُس نے پانی تک پینے سے انکار کر دیا تو سر نے کہا:

"سفیر! اِس کنجر کو سمجھاؤ، دوست اور دشمن میں تمیز کرے۔ اِس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، یہ بتاتا بھی نہیں اور اپنا بیڑہ غرق کر رہا ہے۔"

سفیر نے کہا: "سر جی! اِس نے میرے گھر آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اِسے کیا ہو گیا ہے؟"

یہ سفیر ہی تھا جو اُسے بابا جی کے پاس لے گیا تھا۔ "یار تو اپنا سارا مسئلہ اُنہیں بتانا، اگر اُنہوں نے تیرے اُوپر نظر کر دی تو سمجھ تیرا مسئلہ بالکل حل ہو جائے گا۔"

اُس نے بابا جی کے پاس جانا شروع کر دیا۔ بابا جی کسی طرح بھی اللہ والے نہیں لگتے تھے، کتابوں کی دکان تھی اُن کی۔ اُس سے گزر بسر ہو رہی تھی، سلمان اُن کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ وہاں وہ جی بھر کر پانی پیتا، تین بار چائے پیتا اور کبھی کبھار کھانا بھی کھا لیتا۔ بابا جی سے اُس کی تفصیلاً بات ہوتی، وہ ایک ایک بات اُنہیں بتاتا۔ اُنہوں نے اُسے کہا کہ وہ جہاں سے بھی چاہے، کھانا کھائے، پانی پیے، اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ خواہ مخواہ خود کو بھی تکلیف نہ دے اور گھر والوں کو بھی نہ ستائے۔ وہ جب تک وہاں بیٹھا رہتا، اُن کی باتیں اُس کے دل پر اثر کرتیں اور جب وہاں سے اُٹھتا پھر اُس کا وہی حال ہوتا۔ اب تو اُس کی بیوی بھی اُسے سمجھا سمجھا کے تھک گئی تھی۔

کنڈیکٹر کی آواز اُسے پھر حال میں لے آئی۔ اُس نے دیکھا گاڑی سواریوں سے بھر چکی تھی۔ اُس نے کنڈیکٹر کو کرایہ دیا اور سوچنے لگا کہ آج اِس بات کو چار سال ہو گئے ہیں۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا لیکن آج وہ ایک پراگندہ سوچ کا مالک، لٹا ہوا اور ٹُوٹا پھوٹا آدمی تھا۔ وہ سوچتا کہ کاش وہ بھی ایک پر سکون زندگی گزار سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اِس مصیبت سے وہ خود اپنے آپ کو نکال سکتا ہے۔ کوئی دوسرا ایک حد سے زیادہ اُس کی مدد نہیں کر سکتا لیکن شاید وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔ اب واپسی ناممکن تھی یا پھر کوئی انہونی ہو جاتی۔ کبھی وہ سوچتا پتا نہیں کہاں مجھ سے ایسی غلطی یا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کی مجھے یہ سزا ملی۔ پھر وہ خود ہی جواب دیتا۔ کہ اُس نے تو آج تک نادانستہ طور پر بھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ کہاں یہ کہ جان بُوجھ کر کسی کو تکلیف دی جائے۔ پھر وہ سوچتا کہ شاید اللہ کی رضا یہی ہے کہ وہ اِسی حال میں رہے۔ تو پھر اُسے راضی بارضا رہنا چاہیے۔ لیکن پھر وہ ہر ایک کو اپنے دکھ کیوں بتاتا ہے۔ کیا وہ اللہ کی رضا پہ راضی نہیں ہے؟

اُنہی دنوں اُسے بنک کے کام سے لاہور جانا پڑ گیا۔ رات کو اُس نے جانا تھا تو شام کو اُس کی ہمسائی نازیہ روتے ہوئے اُس کے گھر آئی۔ اُس کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اُسے آپریشن کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ سلمان نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر اُس نے اپنے پاس رکھے پچاس ہزار روپے نازیہ کو دے دیے۔ یہ پیسے اُس نے لیپ ٹاپ خریدنے کے لیے پس انداز کیے تھے۔ عالیہ کو

اور ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکل آیا۔ گاڑی مقررہ وقت پر چل پڑی۔ گاڑی رات کو کلر کہار انٹر چینج پہ رُکی تو وہ ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ اُس کے سامنے ایک نوجوان آدمی کھڑا تھا۔ وہ اچانک کہیں سے نمودار ہوا تھا۔ اُس نے ایک بار سلمان کی طرف جو دیکھا تو سلمان کو زمین آسمان گھومتے نظر آئے۔ اُس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ پھر وہ گویا ہوا:

"سلمان صاحب! مطمئن ہو کر زندگی گزاریں۔ ابھی جو نہیں آئی اُس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان نہ ہوں، ویسے بھی ابھی آپ کا نمبر دُور ہے۔"

☆☆☆

غزل

غزل۔۔۔فرحت شکور

کوئی شکوہ نہیں ہے ہم کو اپنی بے نوائی سے
ملے ہیں حوصلے کیا کیا تمہاری بے وفائی سے
تمہاری بے نیازی نے جنوں کو پختگی بخشی
ہزاروں لطف پائے ہم نے تیری کج ادائی سے
یہ تنہائی یہ رسوائی تو ہے انجام چاہت کا
بھلا ہم مر نہ جائیں گے ذرا سی جگ ہنسائی سے
وہ جس نے جرمِ اُلفت کی سزا میں فرقتیں بخشی
اُسے کہنا کوئی مرتا نہیں دردِ جدائی سے
ہزاروں خواب ٹھکرا کر یہ کس کے راستے دیکھے
کوئی پوچھے مری آنکھوں کی بجھتی روشنائی سے
تمہاری یاد کے قید و قفس میں زندگی گزری
رہے محروم ہم تیرے خیالوں کی رہائی سے
یہ ممکن تھا وہ میرے شعر سن کر واہ واہ کرتا
اگر اس شوخ کو فرصت جو ملتی خود ستائی سے
وہ اپنی سلطنت کا ہی خدا ہوگا ، اسے کہنا
نہ دیکھے ہم فقیروں کو ادائے کبریائی سے
ہزاروں راہزنوں سے بچ کے جو پہنچے تھے منزل پر
انہیں یاروں نے لوٹا ہے فریبِ پارسائی سے
یہی شیوہ ہے اپنا تو بھلائی کر ، برائی سے
عوض پھولوں کے ہم نے تو ہمیشہ زخم کھائے ہیں

میرے رہوار سے جو زندگی بھر طے نہ ہو پایا
ہے کیسا فاصلہ اس ہاتھ کا میری کلائی سے
خزاؤں نے بسیرا یوں کیا ہے گلشنِ جاں میں
رہے محروم جیون بھر گلوں کی آشنائی سے
کبھی دھرتی پھٹی نہ ہی کبھی وہ آسماں لرزا
امیر شہر کیوں جاگے غریبوں کی دھائی سے
تیرے حصے کی خوشیوں سے بھری ہیں جھولیاں کتنی
کئی سر ڈھک گئے فرحتؔ تمہاری بے ردائی سے

غزل۔۔۔ڈاکٹر شفیق آصف

محبت کی کرشمہ سازیاں آواز دیتی ہیں
تری یادوں کی الہڑ شوخیاں آواز دیتی ہیں
ذرا سی دیر میں موسم بدلنے کا زمانہ ہے
ہوا کے بازوئوں کی چوڑیاں آواز دیتی ہیں
مسافر لوٹنا چاہو تو لمحوں میں پلٹ جاؤ
تمہیں ساحل پہ ٹھہری کشتیاں آواز دیتی ہیں
خزاں کے خوف سے سہمے پرندو لوٹ بھی آئو
تمہیں پھر لہلہاتی ٹہنیاں آواز دیتی ہیں
میں جب بھی شب کے دامن پر کوئی سورج اگاتا ہوں
تری سوچوں کی گہری بدلیاں آواز دیتی ہیں
چلے جاتے ہیں ہم اپنا لہو ایندھن بنانے کو
دھواں دیتی ہوئی جب چمنیاں آواز دیتی ہیں

ذرا سی دیر کو کچھ شادماں لمحے عطا کر دو
ذرا سننا غموں کی تلخیاں آواز دیتی ہیں
شفیق احباب اکثر یاد آتے ہیں ہمیں اب بھی
ہوا کے ساتھ بجتی تالیاں آواز دیتی ہیں

غزل۔۔۔ڈاکٹر انوار علی انوار

شومئ قسمت ہے یا اک کھیل ہے تقدیر کا
رنگ اب مجھ سے نہیں ملتا میری تصویر کا
غرق ہوتا ہی رہا، برباد ہوتا ہی رہا
خواب جس نے بھی یہاں دیکھا کوئی تعمیر کا
مجھ سے بڑھ کر اس کو میری شاعری اچھی لگی
یہ کرشمہ دیکھ لے کوئی میری تحریر کا
اس نے جاکر اور ہی دنیا نئی آباد کی
مستقبل حصہ رہا ہے جو میری جاگیر کا
جس نے ذہنوں کو غلامی میں کیا تھا پختہ تر
منتشر میں نے کیا وہ سلسلہ زنجیر کا
ہائے دو راہے پہ میں آکے کھڑا ہی رہ گیا
خواب سے باغی تھا ہر اک راستہ تعبیر کا
میں نے انور راہ پر ڈالا نہیں اس شوخ کو
ہر گناہ اس کا تسلسل ہے میری تقصیر کا

غزل۔۔۔رحمان امجد مراد

جیت پائے نہ کبھی اور نہ ہارے مجھ کو
کاش وہ جھیل سی آنکھوں میں اتارے مجھ کو
میں جو الجھا ہوں تو اسکا بھی کوئی مطلب ہے
میری خواہش ہے کہ وہ آ کے سنوارے مجھ کو
اس کے ہونٹوں کی بناوٹ میں کہیں چھپ جاؤں
اس کا ہو جاؤں اگر دل سے پکارے مجھ کو
کون پاگل ہے جسے اپنی خبر ہوتی ہے
پھر بھی کرتے ہیں کئ لوگ اشارے مجھ کو
کب مرے درد کو سمجھیں گے یہ دریا والے
کب سنبھالیں گے مرے یار کنارے مجھ کو
نخل ہونے کی سزا دیں گے مجھے جانتا ہوں
جڑ سے کاٹیں گے کسی روز یہ آرے مجھ کو
چاند کو بانٹ دیا آج فقیروں میں مراد
بانٹنے آے ہیں آپس میں ستارے مجھ کو

غزل۔۔۔نوید ملک

ہے کوئی سوگوار، تو کوئی خفا لگے
میرا وہ ہمسفر ہے تو دنیا کو کیا لگے
۔پنچھی خزاؤں میں بھی اسی کا کریں طواف
یعنی کسی درخت کو تیری دعا لگے

آب و ہوا پہ چھانے لگی ہے شگفتگی
موسم بھی تیرے حسن میں اب مبتلا لگے
آنے لگی صدا، کہ مدد چاہیے ہمیں
ہم بھی عظیم لوگ تھے،کوفے سے جا لگے
سہتے ہیں اضطراب مگر توڑتے نہیں
گلشن میں کوئی پھول اگر بے وفا لگے
مر جائے گا مگر نہیں بیچے گا وہ ضمیر
کشمیر! جس وجود کو تیری ہوا لگے
اک عکس اُس میں کھلتے ہی تصویر ہو گیا
گھر میں جو آئنہ مجھے سب سے جدا لگے

غزل۔۔۔مبشر سعید

کوئی ملتا ہی نہیں سوختہ پا میری طرح
جس کو معلوم ہو وحشت کا پتا میری طرح
میرے جیون کو اُداسی سے ملانے والا!
دشت میں پھرتا رہے آبلہ پا میری طرح
میں نے احباب کو آواز لگا کر پوچھا
کوئی رہتا ہے شبِ غم میں سدا، میری طرح؟
اے کئی دن سے مرے ذہن پہ چھائے ہوئے شخص
تو مجھے وصل کے سپنے نہ دکھا میری طرح
رات بھر چاند کو احوال سنانے کے لیے
کیا ٹھہرتی ہے دریچوں میں ہوا، میری طرح؟

زندگی! میری طرف دیکھ کے ایماں سے بتا
ایک بھی شخص کوئی تجھ کو مِلا، میری طرح
تند اور تیز ہواؤں کے علاقے میں سعید
زیست کرتا ہے فقط دل کا دِیا میری طرح

غزل۔۔۔طاہر وحید

نگار-ہجر کو اک دن وصال کرنا تھا،
اور اس وصال کو پھر لا زوال کرنا تھا۔
یہ کیا کہ تم نے بھی یادیں نچوڑ لیں دل سے،
تمہیں تو رابطہء خوں بحال کرنا تھا۔
تمہاری چاہ میں ہم نے مٹا دیا خود کو،
کچھ اس طرح کا تمہیں بھی کمال کرنا تھا۔
تمہاری یاد سے دامن چھڑا لیا ہم نے،
تمہاری یاد نے اک دن نڈھال کرنا تھا۔
ہمارے نام پہ تہمت وفا کی رکھنی تھی،
ہمارے زخموں کا کچھ اندمال کرنا تھا۔
اسے بھی حسن میں یکتائی کا دماغ سا تھا،
ہمیں بھی عشق میں خود کو مثال کرنا تھا۔
تمہارا ہجر ہوا ہمسفر، تو خوب ہوا،
تمہارے وصل نے جینا محال کرنا تھا۔
تمہاری دید کا کاسہ سدا رہیں طاہر،
ہماری آنکھوں کا کچھ تو خیال کرنا تھا۔

غزل۔۔۔سید عدید

دل سے اک شخص کی یادوں کو رہا کرتے ہوئے
مر ہی جاوں نہ کہیں اس کو قضا کرتے ہوئے
تو کہ معبود سے نگران بھی سکتا ہے
میں نے سوچا ہی نہ تھا تجھ کو خدا کرتے ہوئے
ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہم و گماں میں بھی نہ تھا
لب پہ اک نام جو آیا ہے دعا کرتے ہوئے
ہر کہانی کے قلم کار نے کیوں مار دیے
سارے کردار محبت میں وفا کرتے ہوئے
ہاتھ میں رنگ رکھا ، باد صبا پر آنکھیں
پھول سے پھول کی خوشبو کو جدا کرتے ہوئے
شہر کا شہر ہی ویران نہ ہو جائے کہیں
میرے اک خواب کو تعبیر نما کرتے ہوئے
اب تو میں لوٹ کے جنگل میں نہیں جا سکتا
کھو گیا ہوں میں ترے گھر کا پتا کرتے ہوئے
تو کہے تو میں ترے دل سے نکل جاتا ہوں
میں نے جنت بھی چھوڑی تھی خطا کرتے ہوئے
آندھیوں سے تو مری جنگ نہیں ہے کوئی
شمع تو بجھنے نہ دی ذکر ہوا کرتے ہوئے
میں نے خیرات میں بھی پیار ہی مانگا ہے عدید
سوچتے کیا ہے سخی مجھ پہ عطا کرتے ہوئے

نظم

نظم۔۔۔ڈاکٹر شفیق آصف

,,آؤ خود کو ڈھونڈتے ہیں،،

جانے کب سے کھو چکا ہوں شہر میں
جانے کب سے اپنا چہرہ ڈھونڈ تا پھر تا ہوں میں
شہر کے ان راستوں میں
کس قدر تنہائی ہے
ہر کوئی تنہائیوں کی
بھیڑ میں کھویا ہوا ہے
یوں تو سورج کا اجالا ضوفشاں ہے
پھر بھی گلیوں میں ابھی تک
تیر گی سی ہے رواں
ایسے عالم میں بھلا ہم
کیسے ڈھونڈیں خود کو اپنے شہر میں
شہر اپنا ہے مگر ہم
ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود کو
جانے کب دیکھیں گے ہم اک آشنا چہرہ کوئی
گر یہاں کوئی ہمارا آشنا چہرہ نہیں تو
آؤ خود کو ڈھونڈ لیں
آؤ خود کو دیکھ لیں
شہر کی اس بھیڑ میں

نظم۔۔۔ازہر ندیم

اس سے آگے تقدس کا آغاز ہے
اس سے آگے تقدس کا آغاز ہے
اس سے آگے تو حیرت بچی ہے محض
یہ ترے وصف لفظوں کی حد سے وراہو گ ئی ے
یہ تری بات ایسے امر ہو گ ئی ی
روشنی سے بھرا، رنگ اور نور کا
پاس میرے کوئی استعارہ نہیں
دور پھیلے ہوئے آسماں کی قسم
اس کا مہتاب ایسا منور نہیں
اس پر اتنا درخشاں ستارہ نہیں
اس سے آگے کی ترتیب میں بس مرا عجز ہے
خامشی کے غلافوں میں لپٹا ہوا
عشق قطرہ تھا اک
قلزمِ حسن سے
آخرش جا ملا
اس سے آگے مناجات کا وقت ہے
اس سے آگے تقدس کا آغاز ہے

نظم۔۔۔طاہر وحید

"چلو.....پھر"

چلو اب "عرصہء ہجرت" میں مدت لے کے آئیں...

چلو گھر لوٹ جائیں،
چلو بارش کو رنج-رائیگانی سے بچائیں...!
چلو ہم بھیگ آئیں،
چلو پیروں سے لپٹے راستوں کو پائمالی سے بچائیں...!
چلو منزل کو اب گھر لے کے آئیں،
چلو منظر کی ویرانی سے آنکھوں کو بچائیں...!
چلو خوابوں کو ان میں لا بٹھائیں،
چلو آئینے کو بے چہرہ لوگوں کی رفاقت سے چھڑائیں...!
چلو ہم خود کو اس کے روبرو لائیں،
چلو اب منجمد رشتوں کو تجدیدِ تعلق سے جگائیں...!
چلو "دل اوک" میں جذبوں کی تھوڑی دھوپ بھر لائیں،
چلو کم مائیگی میں مبتلا لفظوں کی قسمت جگمگائیں...!
چلو ان میں تمہارا "نام" رکھ آئیں،
چلو پھر عشرتِ ابر-رواں سے حظ اٹھائیں...!
چلو پھر حسرت-کوزہ گراں کو آزمائیں،
چلو اپنی دعا کو نارسائی کی اذیت سے بچائیں...!
چلو باب-دعا "خود" کھول آئیں،

کچھ "نقش فریادی" کے بارے

نقش فریادی۔۔۔ایک تعارف

وجیہہ ضمیر

"رسالہ" عربی لفظ ہے۔ جس کا معنی ترسیل کا آلہ ہے۔ اردو رسائل نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ادبی رسالہ میں ادب کی مختلف ادبی جہات مثلاً شاعری، ناول، افسانہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زمانہ قدیم سے عہد جدید تک اردو ادبی رسائل کی اہمیت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے کسی بھی زبان کے ادب کے فروغ میں رسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جہاں اردو رسائل نے ہماریر وایات و اقدار، تہذیب و تمدن، کلچر، ثقافت میں اہم کردار ادا کیا ہے وہیں ادب کے فروغ میں بھی کلیدی حثیت رکھتے ہیں۔ اردو ادبی رسائل ہمارے تنقیدی نظریات و معیاری تخلیقات اور فکر و فن کو موضوع سخن بناتے ہیں اور ادب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو رسائل نے ادب کے مختلف موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اورادبی رسائل خصوصی ادبی شمارے یا ادبی رسائل نمبرز بھی شائع کرتے ہیں جن میں افسانہ نمبر، ناول نمبر، غالب نمبر، شاعری نمبر، اقبال نمبر، غزل نمبر، مرثیہ نمبر، نعت نمبر اور ناولٹ نمبر اور خصوصی شخصیت نمبر بھی جاری کئے ہیں۔ اردو رسائل و جرائد ادب کے ترجمان ہیں اردو ادبی ورسائل و جرائد انسانی جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ادبی رسائل ادبی صحافت کے میدان میں بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ادبی رسائل میں ہفتہ وار، ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی، اور سالانہ مجلے بھی ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی اشاعت کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ یہ۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی شعور کو اجاگر کرتے ہیں۔

برصغیر پاک وہند میں ادبی رسائل و جرائد کی اک توانار وایت موجود ہے،، جس کی وجہ سے ادب پھیلنے پھولنے لگ گیا۔ ان رسائل نے اپنے عہد کی ترجمانی کی اورادب وادبی مباحث کھل کر سامنے آئے اور ان ادبی رسائل کی وجہ سے مختلف شعرا وادبا کے کلام سے واقفیت حاصل ہوئی۔ بیسویں صدی نئے رجحانات، نئے امکانات، نئے جذبات و احساسات، نئے انکشافات اور نئے تقاضوں، اور ایجادات، نئے کی صدی ہے۔ اس صدی میں علم وادب کی ترقی کے لئے رسائل و جرائد نے اہم خدمات سرانجام دیں۔ دور حاضر میں جہاں اُردو رسائل کی جگہ انٹرنیٹ، فیس بک اور ٹیکنالوجی نے لے لی ہے، لیکن اس کے باوجود اس بات پر یقین کرلینا کہ رسائل و جرائد کی اہمیت آج کے عہد کے لیے ضروری نہیں تو درست نہ ہو گا۔ اس ترقی سے رسائل و جرائد مواد نئے طریقوں سے قاری تک پہنچانے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

بے شک مادی ضروریات نے انسان کو جکڑ لیا ہے مگر ذہنی سکون اور پرورش کے لیے اردو رسائل تیز اور موثر ذریعہ ہیں۔ انٹرنیٹ ،اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب ہونے کے باوجود اردو رسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ رسائل سرکاری ہیں ،اور کچھ غیر سرکاری۔

اگر غیر سرکاری رسالوں کی بات کی جائے تو ان کی تعداد سرکاری رسالوں سے بہت زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد سوا دو سو کے قریب ہے۔ جن میں ایسے بھی ہیں جن کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، کہ اردو کے مختلف رسائل پر زوال بھی آیا ان کی اشاعت پر پابندی بھی لگادی گئی مگر

اس کے باوجود یہ بات مسلم ہے کہ نئے رسائل اب بھی جنم لے رہے ہیں۔ جو رسائل سماجی ضرورت اور ذہنی ارتقاء کی پیش رفت رکھتے ہیں وہ جلد ہی مقبولیت عام حاصل کر لیتے ہیں ادب کے مختلف رجحانات وادوار سے متاثر، متنوع قسم کے قارئین موجود ہیں جو ان رسائل سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

آج بھی نئے ادبا و شعرا کی کھیپ پیدا ہو رہی ہے اور نئے نئے اسالیب اور ہیئت کے تجربات کر رہی ہے اور خوش قسمتی یہ ہے کہ اردو رسائل و جرائد ان سے ہمیں متعارف بھی کروا رہے ہیں۔ ابتداء میں ہفتہ وار اخبارات ہی ادبی مضامین اور ادب کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اردو رسائل و جرائد کی ابتداء کے بارے میں جاننا ہو تو مشکل ہی کہ اس ان کی دستیابی ہو سکے۔ برصغیر میں انیسوی صدی کی وسط میں ادب کے فروغ کے لیے گل دستہ باعنوان "گلِ رعنا" پانی پتی کریم الدین نے نکالا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ جس میں مختلف شعرا کے کلام کو یکجا کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ 1857ء کی جنگ کے بعد اہم اردو رسائل و جرائد جیسے "اودھ پنچ"، "تہذیب الاخلاق" وغیرہ نے ادبی خدمات سرانجام دیں تھیں۔ تقسیم سے قبل کی بات کی جائے تو ایسے بہت سے جرائد تھے جن کی گونج پورے برصغیر میں گونجتی تھی۔

ان کے نام درج ذیل ہیں:

مخزن، ہمایوں، الناظر، نظام، معارف، اردوئے معلی، ، عصمت، اردو، نگار، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال، شاعر، ساقی، شاہکار، الہلال، سب رس، آج کل، کتاب، افکار، نیا دور، فنون، وغیرہ تھے ان رسائل کی مجموعی تعداد لگ بھگ 70 تھی اور دوسری بات تقسیم کے بعد بھی ان میں سے رسائل کی اشاعت ہوتی رہتی تھی۔ ان میں ادب اور تاریخ و اسالیب وغیرہ پر تنقیدی مضامین شائع ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر فنون لطیفہ کے بارے بھی مضامین شائع ہوتے تھے آج کل بھی کئی ادبی حوالے سے گراں قدر مواد فراہم کر رہے

ہیں۔ہندوستان میں صحافت کی انیسویں صدی میں داغ بیل پڑ گئی۔اس وقت بر صغیر میں چھاپے خانے بن چکے تھے بر صغیر میں صحافت کا مقصد لوگوں تک خبریں پہنچانا تھا اور علم وفنون کو فروغ دینا تھا۔

"نقش فریادی" ایک تعارف

اُردو رسائل کے بغیر اردو ادب کی ترقی ناگریز ہے۔فروغ اردو کے لیے رسائل وجرائد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اردو رسائل وجرائد میں علمی وادبی سیاسی، خبری، معلوماتی، تعلیمی اور سائنسی مواد کی پیشکش کی جاتی ہے۔ان رسائل کی مدت اشاعت مختلف ہوتی ہے۔۔ جیسے روزنامے، دور دوزے، سہ روزے، ہفتہ روزے، پندرہ روزے، ماہنامے، دوماہی، سہ ماہی، ششماہی، اور سالنامے وغیرہ شامل ہیں۔اردو رسائل وجرائد ہمیں شاعر، افسانہ نگار اور نقاد سے متعارف کرواتے ہیں۔ہمارے سامنے یہ معیاری تحریروں کی پیشکش کرتے ہیں۔ادب اور شاعری کی ترسیل وتوسیع میں ادبی رسائل وجرائد کی جتنی اہمیت ہے۔اتنی شاید کتابوں کی نہیں ہے۔ مخزن زمانہ، ساقی، ادب لطیف ادبی دنیا جیسے رسائل نے اپنے عہد کے تخلیق کاروں کی تخلیقات کو پیش کیا اور بڑے بڑے نقاد محقق اور شعرا کو جنم دے کر علمی وادبی مباحث کے ساتھ ساتھ ساتھ علوم فنون لطیفہ کو اپنے دامن میں جگہ دی پھر ان کے فروغ میں معاونت کی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

"نقش فریادی" کلاسیکل اور جدید ادب کا ترجمان سہ ماہی رسالہ منظر عام پر آچکا ہے۔اس رسالے کی پہلی اشاعت جولائی تا ستمبر سن 2022 ہے۔اس رسالے کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر نصیر احمد اسد جبکہ مدیر منتظم ڈاکٹر عبدالمنان جیمہ اور مدیر کومل شہزادی ہیں۔جن لوگوں کی زیر نگرانی اس شمارے کی اشاعت ہوئی ان میں ڈاکٹر انصر جاوید گھمن ڈاکٹر طالب علی اعوان، محمد اکرم، پروفیسر محمد انور الٰہی چوہدری، اور ڈاکٹر شکیل اختر ٹھاکر شامل ہیں۔ مجلسی مشاورت میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر محمد یوسف خشک، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر ڈاکٹر غلام عباس گوندل، ڈاکٹر شفیق آصف، ڈاکٹر محمد افضال بٹ، پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل، پروفیسر فرحت نسیم علوی، پروفیسر ڈاکٹر آصف اقبال، پروفیسر عامر اقبال، پروفیسر ڈاکٹر طارق کلیم، میاں محمد آصف اقبال، پروفیسر ڈاکٹر احمد عبداللہ قمر، پروفیسر ڈاکٹر علی قزلباش، پروفیسر ڈاکٹر محمد یار گوندل، پروفیسر ڈاکٹر احمد محفوظ، پروفیسر ڈاکٹر ڈرمس بلگرر (ترکی) شامل ہیں۔

اس خصوصی شمارے میں جدید ادب کے فروغ کی کوشش کی گئی ہے۔اس رسالے میں مختلف حصے مختص کیئے گئے ہیں اس کے کل چار حصے ہیں۔پہلا حصہ اداریہ کے نام سے ہے جس میں مختلف محققین اور ناقدین کے تنقیدی مضامین ہیں جو مختلف نوعیت کے ہیں ۔دوسرا حصہ "اقبالیات" پر ہے جس میں ایک اقبالیات پر ایک تنقیدی مضمون ہے۔تیسرا حصہ "افسانہ" پر ہے جس میں جدید معصر افسانہ نگاروں کے افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔یہ رسالہ نئے لکھنے والوں کے لیے ایک باقاعدہ پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے ،تاکہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور وہ خود کو اُردو ادب میں متعارف کرواسکیں۔شعرا و ادبا کو متعارف کروانے والے

یہ تو رسائل و جرائد ہی تھے جنہوں نے گمشدہ لکھاریوں جو قارئین سے متعارف کروایا۔ تیسرا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جس میں مختلف شعراء کی ایک ایک غزل شامل کی گئی ہے۔ آخری حصہ "نظم" پر ہے جس میں کل تین نظمیں ہیں۔

یہ سہ ماہی جریدہ قارئین کو نت نئی تخلیقات سے متعارف کروائے گا امید ہے اس کا مستقبل تابناک ہو گا۔

اس کا دوسرا شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2022 ہے۔ اس شمارے کے کل چھ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آٹھ تنقیدی مضامین ہیں۔ دوسرے حصے میں تبصرے شامل کئے جس میں کل تین تبصرے ہیں۔ تیسرا حصہ "افسانچے" پر مبنی ہے جس میں کل تین افسانچے ہیں جو عصری صورتحال کی عین عکاسی کرتے ہیں۔ حصہ چہارم میں کل پانچ افسانے ہیں۔ آخری دو حصے شاعری پر ہیں جس میں مختلف شعرا کی غزلیں اور نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ سہ ماہی جریدہ قارئین کو نئے تخلیق کاروں کی تخلیقات سے متعارف کروائے گا۔ یہ ادبی جریدہ موجودہ دور کے ادبی مزاج کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے

اس رسالے میں جو تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں ان میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے

اس رسالے کے پہلے شمارے میں شامل مضمون ہے اس کا نام ہے "خطہ سیالکوٹ میں اُردو شاعری کی روایت" از ڈاکٹر نصیر احمد اسد

ڈاکٹر نصیر احمد اسد اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ خطہ سیالکوٹ وادب کا گہوارہ ہے۔ جہاں اقبال فیض جیسے قد آور شخصیات نے جنم لیا اس کے علاوہ اس مضمون میں شجر طہرانی، امین حزیں، سید صادق حسین، اثر صہبائی، اصغر سودائی، خواجہ عبد المجید عرفانی، احسان اللہ ثاقب، محمد طفیل، ریاض حسین چودھری، یوسف نیئر، صابر ظفر، اور جابر علی سید جیسے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو اردو شاعری کے ہیت، اسالیب میں اضافے موجب بنے یہ مضمون سیالکوٹ میں جنم لینے شعراء کا احاطہ کرتا ہے

فکشنات کے نئے تخلیقیت امروز سنگ میل، از نظام صدیقی

اس مضمون میں ناول کے فنی لوازمات اس کے ہیئت و اسالیب اور ناولوں کی اقسام پر بات کی گئی ہے۔ مضمون نگار نے ناول کو انسانی شعور و آگہی کا آب حیات کہا ہے۔ عہد جدید کے تخلیق کاروں جیسے مشرف عالم ذوقی، رحمٰن عباس، ترنم ریاض، سید محمد اشرف، خالد جاوید، انیس اشفاق اور نور الحسن کا ذکر کیا گیا ہے۔

سرشام "ایک مختصر تاثر، از جمیل احمد عدیل

اس مضمون میں عارفہ ثمن اختر کے مجموعہ شعری "سرشام" پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ "سرشام" عارفہ ثمن اختر کی غزل و نظم کا مجموعہ ہے۔

جمیل احمد کی "سخن وری بڑی اچھی لگی" از رانا محمد شاہد

جمیل احمد عدیل اکیسویں صدی کے تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں ہیں اس مضمون میں ان کے کالموں کے مجموعے "سخن وری" کا جائزہ لیا گیا ہے

بائیں پہلو کی پسلی "ایک جائزہ از ڈاکٹر ریاض توحیدی کاشمیری

اس مضمون میں احمد رشید کی افسانہ نگاری اور ان کے افسانوی مجموعے واہلو کی پسلی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے احمد رشید کا تعلق علی گڑھ سے ہے

تانثیت ایک جدید اصطلاح ہے جو لاطینی زبان کے لفظ femina تانثیت کا نظریاتی بیان کرنا یعنی عورت کو بحیثیت متعارف کروایا جائے اس مضمون میں تانثیت اس کے پس منظر کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

،تانثیت اور اُردو شاعری، کومل شہزادی

اس مضمون میں تانیثیت کے لفظی واصطلاحی معنی کے ساتھ ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں بات کی گئی ہے اردو شاعری میں جن خواتین نے تانثیت پر قلم کشائی کی اس کو بدلیں سے بیان کیا گیا ہے۔

روہنگیا زبان وادب کا تذکرہ،ڈاکٹر فرحت علوی

اس مضمون میں میانمار ملک کی زبان روہنگیا اور اس کے رہنے والے باشندوں کے زوال کو بیان کیا گیا ہے۔اس خطے کے ادب میں گیت،ماہیے،اور فنون لطیفہ میں اضافے کا موجب بنے۔ آج کل یہ مسلم خطہ زوال کا شکار ہے۔

اُردو تفسیری ادب کا تذکرہ،ڈاکٹر عبدالمنان چیمہ ،

اس مضمون میں قرآن مجید پر تفسیر القرآن پر لکھی گئی تفاسیر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ مضمون قرآن کی تفاسیری کتب کا احاطہ کرتا ہے۔

اُردو سیرت نگاری پیر کرم شاہ الازہری کی "ضیاءالنبی" کے تناظر میں

اس مضمون میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پیر کرم شاہ کی کتاب "ضیاءالنبی" کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مذہبی، سماجی اور ثقافتی بیانیے، تشکیلات رد تشکیلات اور تارڑ کا ناول" قلعہ جنگی" کا ایک مابعد جدید مطالعہ از یوسف نون

اس مضمون میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول ء" قلعہ جنگی" کا مابعد جدید مطالعہ کے تناظر میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو فکشن میں جدید اصناف از منیر عباس سپیرا

اس میں اُردو فکشن کی ہیئت و تجربات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں مائیکرو فکشن، فلیش فکشن،اور افسانچہ شامل ہیں۔

کہانی آوارہ ہوتی ہے: تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر محفوظ احمد ثاقب

اس مضمون میں سلیم اختر ڈھیرہ نے "کہانی آوارہ ہوتی ہے "جو اطالوی لوک داستان کا ترجمہ ہے اس کے خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے کہ آیا یہ ترجمہ کس حد تک ترجمے کے فنی لوازمات پر پورا اترتا ہے یہ ترجمہ عمدہ کاوش ہے۔

سیمیں کرن کے افسانوں میں سماجی، تہذیبی عکس از انعم زاہد

اس مضمون میں دور حاضر کی افسانہ نگار سیمیں کرن کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آخر میں اقبالیات پر ایک مضمون ہے۔

اقبال بحثیت مفکر تعلیم از فریمولوی فیروز الدین ڈسکوی کی ادبی خدمات از ڈاکٹر نصیر احمد

مولوی فیروز الدین ڈسکوی کی ادبی خدمات از ڈاکٹر نصیر احمد اسد مضمون میں مولوی فیروز الدین کی عملی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون مابعد جدید کے نظریہ کا اصل مقولہ از احمد سہیل مابعد جدیدیت اس کے ہیت و اسالیب کا احاطہ کرتا ہے۔

اردو میں افسانوی تنقید کا نیا پیراڈایم اور آصف فرخی "عالم ایجاد "کی روشنی میں از ایم خالد فیاض

مضمون میں آصف فرخی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے آصف فرخی کا شمار بہترین تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔

ناول "دھنی بخش کے بیٹے "میں خیر وشت کا تصور از کومل شہزادی

اس مضمون میں حسن منظر کے ناول "دھنی بخش کے بیٹے "کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حسن منظر نامور تخلیق کار ہیں جو نئے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں

ناول "جہنم جاگتا رہتا ہے "تحقیقی و تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر محفوظ احمد ثاقب

اس مضمون میں "جہنم جاگتا رہتا ہے "سلیم اختر ڈھیرہ کے ترجمہ کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ انہوں نے ترجمہ کی عمدہ کاوش کی ہے۔

نسیم حجازی۔۔۔ تحریک پاکستان کا عملی کردار از عزرا پروین

اس مضمون میں نسیم حجازی نے جو تحریک پاکستان میں جو کردار نبھایا اس کے ساتھ ساتھ علمی سفر کا بھی ذکر کیا ہے۔

ثمینہ سید کی افسانہ نگاری از منیر عباس سپیرا

اس مضمون میں جدید افسانہ نگار تہمینہ سید کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

آخری حصے میں تین تبصرے شامل کیے گئے ہیں جن میں پہلا تبصرہ نعمان نزیر کا ہے دوسرے نمبر پر وجیہہ ضمیر کا جبکہ آخر میں ڈاکٹر انصر جاوید گھمن ہے۔

اُردو رسائل پر عروج وزوال آتا رہا ہے۔ کچھ رسائل متواتر شائع ہوئے تو کچھ رقص شرر ثابت ہوئے۔ آج بھی رسائل و جرائد کی اشاعت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ مختلف جامعات کے توسط بھی رسائل و جرائد منظر عام پر آچکے ہیں جو اسکالر کی حوصلہ افزائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہم کسی طور پر بھی اردو رسائل و جرائد کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ "نقش فریادی" اُردو رسائل میں اضافے کا موجب بنا ہے امید ہے یہ رسالہ اردو ادب میں جلد ہی علمی و ادبی پزیرائی پالے گا۔